رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۳۰

جلد ۵۶ عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۶	بابت جولائی سنہ ۱۹۶۱ء	عدد ۴

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن
اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آپ کو اس امر کا بارہا تجربہ ہوا ہو گا کہ جب کوئی شخص اپنی بات کو دلائل کے زور سے منوانے میں ناکام ہوتا ہے تو پھر وہ اس کے لیے کوئی خارجی سہارا تلاش کرتا ہے۔ ان سہاروں میں سے سب سے بڑا "وقت کا تقاضا" ہے۔ جب آپ لوگوں میں بیٹھ کر انہیں یہ باور کرانے لگیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ وقت کا عین تقاضا ہے تو اس سے فریق مخالف کے متعلق عام تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کوتاہ بیں، تنگ نظر، متعصب اور ضدی شخص ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے فطرت کے خلاف نبرد آزما ہے اور آپ نہایت ہی روشن خیال اور حقیقت پسند ہیں جو حالات کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر صحیح صورتِ حال کو محسوس کر کے اس کے مطابق قدم اٹھا رہے ہیں۔ دورِ جدید میں افکار و نظریات کی دنیا میں جنگ کرنے کے لیے جو عجیب و غریب ہتھیار تیار کیے گئے ہیں ان میں سے یہ ہتھیار غالباً سب سے مؤثر ہے۔

ہمارے اس دور کا ہر مفکر جب بھی کوئی خیال پیش کرتا ہے تو اسے آفاقی بنانے کے لیے سب سے پہلے اس امر کا التزام ضروری سمجھتا ہے کہ کسی طرح اسے تقاضائے وقت یا مطالبۂ فطرت ثابت کیا جائے۔ آپ ایسے مفکرین کے کسی نظریہ کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان کے نزدیک یہ منہ زور ابلقِ ایام اپنی ترنگ میں خود بخود سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا ہے اور انسانیت اس کے ساتھ ہم عناں ہونے پر مجبور رہی ہے۔ دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا راستہ روک سکے۔ جس طرح وقت کی لہروں پر کسی شخص کو

کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا بالکل اسی طرح وقت کی اضطراری چال کے بارے میں انسان بالکل بے بس ہے۔ رہوار زمانہ افکار و نظریات کی جو گرد فضا میں پھیلا دیتا ہے انسان کے لیے اُس سے کوئی مفر نہیں۔ وہ اُسے بڑھ کر اٹھا لینے پر مجبور ہے۔

آپ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مختلف نظریات کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ ان مغربی مفکرین نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ عقائد مابعد الطبیعی نظریات، اور زندگی کے عملی مسائل ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں اور موجودہ حالت ماضی کی ساری حالتوں سے بہتر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر آنے والی حالت موجودہ حالت سے لازمی طور پر ارفع و اعلیٰ ہو گی یا دوسرے لفظوں میں زمانہ اپنی قوت و طاقت سے بالکل میکانکی طور پر انسانوں کے اس گلہ کو ایک خاص سمت میں ہانک کرلے جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر عہدِ قدیم میں انسانیت کے لیے "وقت کا تقاضا" یہ تھا کہ وہ قدرت کے رنگا رنگ مظاہر کو اپنے معبود سمجھ کر ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی۔ اس کے بعد علم جس نسبت سے اس کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ اٹھاتا چلا گیا اسی نسبت سے ان خداؤں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اب جب کہ علم جدید کی روشنی نے آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ہے تو انسان کو خدا کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اب اہلِ مغرب کے نزدیک وقت کا تقاضا یہ ہے کہ معاذ اللہ خدا کو عہدِ جہالت کی ایک یادگار سمجھتے ہوئے اس کا قلادہ جلد از جلد اتار کر پھینک دیا جائے۔ چنانچہ مغربی مفکرین کا ایک طائفہ خدا کے متعلق اسی قسم کے افکار و خیالات پھیلا رہا ہے اور انہیں وقت کے تقاضے کے طور پر عوام کے سامنے پیش کرنے میں مصروف ہے اور ایسے روشن دماغوں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے "فطرت کے اس اشارے" کو سمجھتے ہوئے اسے دل و جان سے قبول کر لیا ہے۔

مابعد الطبیعی نظریات کی رفعتوں سے نیچے اُتر کر اگر عملی زندگی کے مختلف مسائل پر غور کریں گے تو آپ کو ان میں بھی وقت کے عجیب و غریب تقاضے کار فرما نظر آئیں گے۔ یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ انسانیت نے جس روز سے جنم لیا ہے اُس کے ہاں رشتۂ مناکحت ایک مقدس تعلق کے طور پر ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اسی رشتہ پر خاندانی نظام کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ مگر دورِ جدید میں انسان نے یہ محسوس کیا ہے کہ عورت اور مرد کا باہمی تعلق کوئی روحانی اور قلبی تعلق نہیں بلکہ ان دونوں کی ایک حیوانیاتی جبلت انہیں ایک دوسرے کے قریب ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس بنا پر نکاح کے بندھن بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں معاذ اللہ کم عقل لوگوں نے پہن رکھا تھا۔ "فطرت کا منشا" اسی قدر ہے کہ مرد اور عورت جب چاہیں اپنی اس صنفی خواہش کو پورا کر لیا کریں۔ اور اُن کی اس راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہونے پائے۔ یہی نظریہ آج "فطرت کا اشارہ" بنا کر ہمارے سامنے لایا جا رہا ہے اور آج ہم اس مقدس رشتہ کی تعبیر کچھ اس طرح کر رہے ہیں کہ جیسے یہ رشتہ محض جہالت کی یادگار تھا۔ مثلاً ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ عورت عہدِ قدیم ہی سے مظلوم چلی آ رہی ہے اور یہ ہمیشہ مرد کی ہوس کا شکار رہی ہے۔ پرانے وقتوں میں مرد کئی کئی ہزار عورتوں کو اپنے حرم میں ڈال لیا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ جوں جوں علم نے ترقی کی ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اب زمانہ نے اس کی آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ اٹھا کر اس پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ نکاح کے بندھن جنہیں تم اتنا عزیز سمجھتے ہو یہ سب "فطرت کی تعزیریں" ہیں۔ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے اس لیے اُس کی خواہشات کے سامنے کسی چیز کو حائل نہ ہونا چاہیے۔

مغرب کی عیار اور چالاک قوموں نے جنہیں اس وقت دنیا کی سیادت اور قیادت حاصل ہے، افکار و نظریات کی دنیا میں بھی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے جس طرح کمزور اقوام کو غلام بناتے ہوئے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ

جو ظلم و ستم کر رہی ہیں، یا جس قسم کی لوٹ کھسوٹ انہوں نے مچا رکھی ہے وہ دراصل ان کی اپنی خواہش اور منشا کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ فطرت کے اشارے کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ اس لیے کمزوروں کو اس چیز پر قطعاً احتجاج نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان کا یہ احتجاج فطرت کے خلاف احتجاج ہوگا جو کسی جہت سے بھی مناسب نہیں۔ فطرت بڑی طاقتور ہے اور اس کی مخالفت سے انسان اپنا ہی نقصان کرتا ہے اس لیے اُن کے لیے مناسب روش یہی ہے کہ وہ ان سارے مظالم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہیں۔ اگر آپ کو ہماری ان گزارشات پر یقین نہ ہو تو آپ تنازع للبقاء، انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح جیسے باطل نظریات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا ان نظریات کے پیچھے یہی بنیادی تصوّر کارفرما نہیں کہ دنیا میں جو لوگ کمزور ہیں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی فطرت کا اقتضا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو ظلم و ستم بھی کیا جائے وہی قدرت کا حقیقی منشا ہے۔ انہی تصورات کے تحت دنیا کی ہر ظالم اور مستبد قوم نے اپنے آپ کو "اصلح" سمجھتے ہوئے کمزوروں پر دست ظلم دراز کرنا شروع کیا۔ چنانچہ گذشتہ دو صدیوں میں مشرقی قوموں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا ہے وہ سب فطرت کے مطالبہ کے مطابق ہی تھا۔

بالکل یہی صورتِ حال افکار و تصورات کے معاملے میں بھی پیش آ رہی ہے۔ جن افکار و نظریات کو اس وقت یورپ میں قبولِ عام حاصل ہے وہی درحقیقت فطرت کے تقاضے بن کر مشرقی قوموں کے سامنے لائے جا رہے ہیں اور یہ سادہ لوح اقوام انہیں قدرت کے اشارے سمجھتے ہوئے ان پر بلا سوچے سمجھے رقص کر رہی ہیں۔ اُن کے دل و دماغ میں اس باطل تصوّر کو بٹھا دیا گیا ہے کہ دنیا میں جس نظریہ کا عام چلن ہو وہی درحقیقت سب سے صحیح بھی ہوتا ہے اور جو تصوّر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اس کا باطل ہونا ایک یقینی امر ہے۔ اپنی اس بات کو درست ثابت کرنے کے لیے لوگوں کو کچھ اس قسم کا تاثر

دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ محض اپنی رفتار سے کچھ افکار و نظریات کو فروغ دیتا ہے جو وقت کا تقاضا ہوتے ہیں اور وہ خود ہی اپنی مصلحت کے تحت بعض افکار کو جو اس کا ساتھ نہیں دے سکتے ۔۔ پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ اس بنا پر کسی نظریہ کے حق و باطل ہونے کی اصلی کسوٹی محض رفتار زمانہ ہے۔ وقت کا قاضی جو فیصلہ دے دے وہی سو فی صدی درست ہے اور اس کے فیصلوں سے سرِ مُو انحراف کرنا فطرت کو چیلنج کرنا ہے۔

اس نظریے کو یورپ نے تنازع للبقا اور انتخابِ طبیعی کی طرح بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے پیچھے صرف یہی ایک جذبہ کارفرما ہے کہ جن افکار و نظریات پر اس وقت مغربی اقوام مٹی جارہی ہیں انہیں وقت کے تقاضے کی بنا پر مشرقی قوموں کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا جن نظریات کو اہلِ یورپ فطرت کے اشاروں سے تعبیر کر رہے ہیں وہ فطرت کے اشارے نہیں بلکہ مادہ پرست ذہن کے توہمات ہیں جنہیں مادی قوت و طاقت کے بل بوتے پر ساری دنیا کے دماغوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ ہی سرے سے باطل ہے کہ رہوارِ زمانہ محض اپنی رفتار سے کچھ ایسے تصورات اور نظریات سامنے لاتا ہے جو عین منشائے قدرت ہوتے ہیں اور جنہیں قبول کیے بغیر بن نہیں پڑتی۔ زمانہ گردش تو بلا شبہ کرتا ہے مگر یہ سمجھ لینا کہ وہی اپنی اس گردش کے ساتھ کچھ معتقدات اور کچھ تصورات کو بھی جنم دیتا ہے بہت بڑی حماقت ہے۔ زمانے کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے بطن سے کوئی نظریہ پیدا کر سکے۔ نظریات و تصورات خالق وقت کی لہریں نہیں بلکہ انسان کا دماغ ہے۔ ان لہروں میں البتہ یہ قوت ضرور موجود ہے کہ جو شخص یا قوم بھی اپنے دلپسند تصورات کو ان کی مدد سے دنیا میں پھیلانا چاہے۔ یہ فوراً اپنا دستِ تعاون اس کی طرف بڑھا دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ لاتعداد توہمات کی طرح وقت کا تقاضا بھی محض ایک واہمہ ہے اور جو شخص

کسی نظریہ کو وقت کا تقاضا سمجھ کر اس کے سامنے سرنگوں ہونے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے وہ کسی حقیقت کو تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتا بلکہ صرف ایک وہم یا خیال کی اندھی عقیدت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور یہ طرزِ فکر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کے دل و دماغ کسی دَور کے تہذیبی رجحانات سے مرعوب ہی نہیں بلکہ مغلوب بھی ہوتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر احساسِ کہتری کا مظہر ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کے باہمت لوگوں نے اپنی قوتِ فکر و عمل سے وقت کے دھاروں کو بدل کر رکھ دیا اور اپنی سعی و جہد سے اس حقیقت کو ثابت کر دکھایا کہ انسانی تاریخ میں جبر کا کوئی ایسا عنصر نہیں پایا جاتا جو نوعِ بشری کو مجبوراً کسی خاص سمت میں ہانک کر لے جائے۔ دنیا کے جس نظریہ کے لیے خواہ وہ حق ہو یا باطل منظم کوشش کی گئی اور اُس کو ماننے والوں نے اس کے لیے جان و مال کی قربانی، تنظیم، مرکز پسندی اور فہم و تدبّر کا ثبوت دیا وہی نظریہ دنیا میں غالب ہو کر وقت کا تقاضا بن کر سامنے آیا۔ واقعات کے دھارے لیل و نہار کی گردشوں کے ساتھ نہیں بدلتے بلکہ انسانوں کی ذہنی اور عملی قوتیں انہیں اپنے عزم سے تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

دنیا میں آج تک جتنی انقلابی طاقتیں ابھری ہیں انہوں نے اپنے اپنے دَور کے تہذیبی اثرات کے خلاف بغاوت کر کے ہی انسانیت کے فکر و عمل کے سانچوں کو بدلا اور نئے انقلاب کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنے دور کے غالب نظریات کو فطرت کے اشارے سمجھتے ہوئے ان کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو کر بیٹھ جاتے تو انسانیت کسی انقلاب سے آشنا نہ ہو سکتی۔ حضور سرورِ کائنات جس وقت دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ قوت و طاقت اور مال و متاع پر یہی لوگ قابض تھے۔ ان حالات میں وقت کا تقاضا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کی حمایت حاصل کرتے مگر حضور سرورِ دو عالمؐ نے وقت کے تقاضے کی قطعاً پروا نہ کی۔ آپؐ نے حضرت مسیح علیہ السلام اور اُن کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ کی تعریف فرما کر یہودیوں کی ناراضگی مول لے لی اور حضرت مسیح

علیہ السلام کی ابنیت اور الوہیت کا انکار کر کے عیسائیوں کو برہم کر دیا۔ غور کیجیے اگر وقت کا تقاضا کوئی قابلِ التفات چیز ہوتی تو کیا حضورؐ ایسے ہی کرتے کہ وقت کے غالب رجحانات میں سے کسی کا بھی ساتھ نہ دیکر سب کو اپنا دشمن بنا لیتے۔ اگر اس دور کے تہذیبی رجحانات کے سامنے سرنگوں ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا تو پھر ایسی فضا میں اسلامی اقدارِ حیات کو دنیا میں کس طرح فروغ حاصل ہوا اور دیکھتے دیکھتے کیسے یہ دنیا کی غالب اقدار بن گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضورؐ کے جلیل القدر رفقائے کار کو بھی کئی مرتبہ "وقت کے تقاضوں" نے مداہنت سے کام لینے کی دعوت دی مگر انہوں نے اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے کے بجائے حق پرستی کی راہ کو ہی اپنے لیے منتخب کیا۔ اس معاملے میں سب سے پہلی الجھن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ پیش آئی کہ مسلمانوں کے ایک بااثر گروہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان پُر آشوب حالات میں وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ان لوگوں کی اس حرکت سے اغماض برتا جاتا اور انہیں ساتھ ملا کر مرتدین کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جاتا مگر صدیق اکبرؓ نے وقتی مصلحتوں سے یکسر صرفِ نظر کیا اور بڑے عزم کے ساتھ فرمایا: "واللہ! میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے اور رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمے جو حقوق ہوں گے ان کی ادائیگی کا مطالبہ ان سے بہرحال کیا جائے۔

یہ ایک دو واقعات ہم نے صرف وقت کے تقاضوں کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لیے بیان کیے ہیں ورنہ دنیا کی ہر زندہ قوم کی تاریخ اور اس لحاظ سے امتِ مسلمہ کا سارا تاریخی سرمایہ اس بات پر گواہ ہے کہ وہ قومیں جو اس کرۂ ارضی میں اپنے معین مقاصد رکھتی ہیں اور پھر ان کے اندر ان مقاصد کو غالب کرنے کا داعیہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو ان اوہام میں گرفتار نہیں ہونے دیتیں کہ وہ زمانے کے ہاتھوں بے بس ہیں۔

(باقی صفحہ ۲۶۲ پر)

تفہیم القرآن

السجدہ

نام | آیت ۱۵ میں سجدہ کا جو مضمون آیا ہے اسی کو سورہ کا عنوان قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول | اندازِ بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول مکہ کا دورِ متوسط ہے، اور اُس کا بھی ابتدائی زمانہ، کیونکہ اس کلام کے پس منظر میں ظلم و ستم کی وہ شدّت نظر نہیں آتی جو بعد کے ادوار کی سورتوں کے پیچھے نظر آتی ہے۔

موضوع اور مباحث | سورہ کا موضوع توحید، آخرت اور رسالت کے متعلق لوگوں کے شبہات کو رفع کرنا اور ان تینوں حقیقتوں پر ایمان کی دعوت دینا ہے۔ کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آپس میں چرچے کر رہے تھے کہ یہ شخص عجیب عجیب باتیں گھڑ گھڑ کر سنا رہا ہے۔ کبھی مرنے کے بعد کی خبریں دیتا ہے اور کہتا ہے کہ مٹی میں رَل مل جانے کے بعد تم پھر اٹھائے جاؤ گے اور حساب کتاب ہوگا اور دوزخ ہوگی اور جنت ہوگی۔ کبھی کہتا ہے کہ یہ دیوی دیوتا اور بزرگ کوئی چیز نہیں ہیں، بس اکیلا ایک خدا ہی معبود ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں، آسمان سے مجھ پر وحی آتی ہے اور یہ کلام جو میں تم کو سنا رہا ہوں، میرا کلام نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے۔ یہ عجیب افسانے ہیں جو یہ شخص ہمیں سنا رہا ہے ــــ انہی باتوں کا جواب اس سورہ کا موضوعِ بحث ہے۔

اِس جواب میں کفار سے کہا گیا ہے کہ بلاشک و ریب یہ خدا ہی کا کلام ہے اور اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نبوت کے فیض سے محروم، غفلت میں پڑی ہوئی ایک قوم کو

چونکا یا جائے۔ اسے تم افترا کیسے کہہ سکتے ہو جبکہ اس کا منزّل من اللہ ہونا ظاہر و باہر ہے

پھر ان سے فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن جن حقیقتوں کو تمہارے سامنے پیش کرتا ہے عقل سے کام لیکر خود سوچو کہ ان میں کیا چیز اچنبھے کی ہے۔ آسمان و زمین کے انتظام کو دیکھو، خود اپنی پیدائش اور بناوٹ پر غور کرو، کیا یہ سب کچھ اُس تعلیم کی صداقت پر شاہد نہیں ہے جو اس نبی کی زبان سے اِس قرآن میں تم کو دی جا رہی ہے؟ یہ نظام کائنات توحید پر دلالت کر رہا ہے یا شرک پر؟ اور اس سارے نظام کو دیکھ کر اور خود اپنی پیدائش پر نگاہ ڈال کر کیا تمہاری عقل یہی گواہی دیتی ہے کہ جس نے اب تمہیں پیدا کر رکھا ہے وہ پھر تمہیں پیدا نہ کر سکے گا؟

پھر عالمِ آخرت کا ایک نقشہ کھینچا گیا ہے اور ایمان کے ثمرات اور کفر کے نتائج و عواقب بیان کرکے یہ ترغیب دلائی گئی ہے کہ لوگ بُرا انجام سامنے آنے سے پہلے کفر چھوڑ دیں اور قرآن کی اُس تعلیم کو قبول کرلیں جسے مان کر خود اُن کی اپنی ہی عاقبت درست ہوگی۔

پھر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ وہ انسان کے قصوروں پر یکایک آخری اور فیصلہ کن عذاب میں اسے نہیں پکڑ لیتا بلکہ اُس سے پہلے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں، مصیبتیں، آفات اور نقصانات بھیجتا رہتا ہے، ہلکی ہلکی چوٹیں لگاتا رہتا ہے، تاکہ اسے تنبیہ ہو اور اس کی آنکھیں کھل جائیں۔ آدمی اگر ان ابتدائی چوٹوں ہی سے ہوش میں آجائے تو اس کے اپنے حق میں بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ دنیا میں یہ کوئی پہلا اور انوکھا واقعہ تو نہیں ہے کہ ایک شخص پر خدا کی طرف سے کتاب آئی ہو۔ اس سے پہلے آخر موسیٰ (علیہ السلام) پر بھی تو کتاب آئی تھی جسے تم سب لوگ جانتے ہو۔ یہ آخر کونسی ایسی بات ہے کہ اس پر تم لوگ یوں کان کھڑے کر رہے ہو۔ یقین مانو کہ یہ کتاب خدا ہی کی طرف سے آئی

ہے اور خوب سمجھ لو کہ اب پھر وہی کچھ ہو گا جو موسیٰ کے عہد میں ہو چکا ہے۔ امامت و پیشوائی اب انہی کو نصیب ہو گی جو اس کتابِ الٰہی کو مان لیں گے۔ اسے رد کر دینے والوں کے لیے ناکامی مقدر ہو چکی ہے۔

پھر کفارِ مکہ سے کہا گیا ہے کہ اپنے تجارتی سفروں کے دوران میں تم جن پچھلی تباہ شدہ قوموں کی بستیوں پر سے گزرتے ہو ان کا انجام دیکھ لو۔ کیا یہی انجام تم اپنے لیے پسند کرتے ہو؟ ظاہر سے دھوکا نہ کھاؤ۔ آج تم دیکھ رہے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات چند لڑکوں اور چند غلاموں اور غریب لوگوں کے سوا کوئی نہیں سن رہا ہے اور ہر طرف سے ان پر طعن اور ملامت اور پھبتیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اس سے تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ یہ چلنے والی بات نہیں ہے، چار دن چلے گی اور پھر ختم ہو جائے گی۔ لیکن یہ محض تمہاری نظر کا دھوکا ہے۔ کیا یہ تمہارا رات دن کا مشاہدہ نہیں ہے کہ آج ایک زمین بالکل بے آب و گیاہ پڑی ہے جسے دیکھ کر گمان تک نہیں ہوتا کہ اس کے پیٹ میں روئیدگی کے خزانے چھپے ہوئے ہیں، مگر کل ایک ہی بارش میں وہ اس طرح پھبک اٹھتی ہے کہ اس کے چپے چپے نمو کی طاقتیں پھوٹنی شروع ہو جاتی ہیں۔

خاتمۂ کلام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ تمہاری باتیں سن کر مذاق اڑاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ حضرت، یہ فیصلہ کن فتح آپ کو کب نصیب ہونے والی ہے، ذرا تاریخ تو ارشاد ہو۔ ان سے کہو کہ جب ہمارے اور تمہارے فیصلے کا وقت آ جائے گا اس وقت ماننا تمہارے لیے کچھ بھی مفید نہ ہو گا۔ ماننا ہے تو اب مان لو۔ اور آخری فیصلے ہی کا انتظار کرنا ہے تو بیٹھے انتظار کرتے رہو۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

الٓمّٓ - اس کتاب کی تنزیل اس میں کوئی شک نہیں کہ رب العٰلمین کی طرف سے ہے

لہ قرآن مجید کی متعدد سورتیں اس طرح کے کسی نہ کسی تعارفی فقرہ سے شروع ہوتی ہیں جس سے مقصود آغازِ کلام ہی میں یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ کلام کہاں سے آ رہا ہے۔ یہ بظاہر اسی طرز کا ایک تمہیدی فقرہ ہے جیسے ریڈیو پر اعلان کرنے والا پروگرام کے آغاز میں کہتا ہے کہ ہم فلاں اسٹیشن سے بول رہے ہیں۔ لیکن ریڈیو کے اس معمولی سے اعلان کے برعکس قرآن مجید کی کسی سورت کا آغاز جب اس غیر معمولی اعلان سے ہوتا ہے تو یہ محض مصدرِ کلام کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اس میں ایک بہت بڑا دعویٰ، ایک عظیم چیلنج اور ایک سخت انذار بھی شامل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ چھوٹتے ہی اتنی بڑی خبر دیتا ہے کہ یہ انسانی کلام نہیں ہے، خداوندِ عالم کا کلام ہے۔ یہ اعلان فوراً ہی یہ بھاری سوال آدمی کے سامنے لاکھڑا کرتا ہے کہ اس دعوے کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ تسلیم کرتا ہوں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے آگے سرِ اطاعت جھکا دینا ہوگا، پھر میرے لیے اس کے مقابلے میں کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ تسلیم نہیں کرتا تو لامحالہ یہ خطرۂ عظیم مول لیتا ہوں کہ اگر واقعی یہ خداوندِ عالم کا کلام ہے تو اسے رد کرنے کا نتیجہ مجھ کو ابدی شقاوت و بدبختی کی صورت میں دیکھنا پڑے گا۔ اس بنا پر یہ تمہیدی فقرہ مجرد اپنی اس غیر معمولی نوعیت ہی کی بنا پر آدمی کو مجبور کر دیتا ہے کہ چوکنا ہو کر انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس کلام کو سنے اور یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کلامِ الٰہی ہونے کی حیثیت سے تسلیم کرنا ہے یا نہیں۔

یہاں صرف اتنی بات کہنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے کہ یہ کتاب رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے، بلکہ مزید براں پورے زور کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ۔ بےشک یہ خدا کی کتاب ہے، اس کے منزّل من اللہ ہونے میں قطعاً کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اس تاکیدی فقرے کو اگر نزولِ قرآن کے واقعاتی پس منظر اور خود قرآن کے اپنے سیاق میں دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی مضمر ہے۔ اور یہ دلیل مکہ معظمہ کے ان باشندوں

کیا ۳۸ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اسے خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ حق ہے

سے پوشیدہ نہ تھی جن کے سامنے یہ دعویٰ کیا جا رہا تھا۔ اس کتاب کے پیش کرنے والے کی پوری زندگی اُن کے سامنے تھی، کتاب پیش کرنے سے پہلے کی بھی اور اس کے بعد کی بھی۔ وہ جانتے تھے کہ جو شخص اس دعوے کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا ہے وہ ہماری قوم کا سب سے زیادہ راستباز، سنجیدہ اور پاک سیرت انسان ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ دعوائے نبوت سے ایک دن پہلے تک بھی کسی نے اس سے وہ باتیں کبھی نہ سنی تھیں جو دعوائے نبوت کے بعد یکایک اس نے بیان کرنی شروع کر دیں۔ وہ اس کتاب کی زبان اور طرزِ بیان میں اور خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اور طرزِ بیان میں نمایاں فرق پاتے تھے اور اس بات کو بداہتہً جانتے تھے کہ ایک ہی شخص کے دو اسٹائل اتنے صریح فرق کے ساتھ نہیں ہو سکتے۔ وہ اس کتاب کے انتہائی معجزانہ ادب کو بھی دیکھ رہے تھے اور اہلِ زبان کی حیثیت سے خود جانتے تھے کہ ان کے سارے ادیب اور شاعر اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ وہ اس سے بھی ناواقف نہ تھے کہ ان کی قوم کے شاعروں، کاہنوں اور خطیبوں کے کلام میں اور اس کلام میں کتنا عظیم فرق ہے، اور جو پاکیزہ مضامین اس کلام میں بیان کیے جا رہے ہیں وہ کتنے بلند پایہ ہیں۔ انہیں اس کتاب میں، اور اس کے پیش کرنے والے کی دعوت میں کہیں دور دور بھی اُس خود غرضی کا ادنیٰ شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا جس سے کسی جھوٹے مدعی کا کام اور کلام کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ وہ خوردبین لگا کر بھی اس امر کی نشان دہی نہیں کر سکتے تھے کہ نبوت کا یہ دعویٰ کر کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ذات کے لیے یا اپنے خاندان کے لیے یا اپنی قوم اور قبیلے کے لیے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کام میں ان کی اپنی کیا غرض پوشیدہ ہے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ اس دعوت کی طرف ان کی قوم کے کیسے لوگ کھنچ رہے ہیں اور اس سے وابستہ ہو کر ان کی زندگیوں میں کتنا بڑا انقلاب واقع ہو رہا ہے۔ یہ ساری باتیں مل جل کر خود دلیلِ دعویٰ بنی ہوئی تھیں۔ اسی لیے اس پس منظر میں یہ کہنا بالکل کافی تھا کہ اس کتاب کا رب العالمین کی طرف سے نازل شدہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اس پر کسی دلیل کے اضافے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

تیرے رب کی طرف سے ہے تاکہ تو متنبہ کرے ایک ایسی قوم کو جس کے پاس تجھ سے پہلے

؎ اس تمہیدی فقرے کے بعد مشرکین مکہ کے پہلے اعتراض کو لیا جا رہا ہے جو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر کرتے تھے۔

؎ یہ محض سوال و استفہام نہیں ہے بلکہ اس میں سخت تعجب کا انداز پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ساری باتوں کے باوجود، جن کی بنا پر اس کتاب کا منزل من اللہ ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، کیا یہ لوگ ایسی صریح ہٹ دھرمی کی بات کہہ رہے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسے خود تصنیف کر کے جھوٹ موٹ اللہ رب العالمین کی طرف منسوب کر دیا ہے؟ اتنا لغو اور بے سروپا الزام رکھتے ہوئے کوئی شرم ان کو نہیں آتی؟ انہیں کچھ محسوس نہیں ہوتا کہ جو لوگ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اور اُن کے کام اور کلام کو جانتے ہیں اور اس کتاب کو بھی سمجھتے ہیں، وہ اس بیہودہ الزام کو سن کر کیا رائے قائم کریں گے؟

؎ جس طرح پہلی آیت میں لاریب فیہ کہنا کافی سمجھا گیا تھا اور اس سے بڑھ کر کوئی استدلال قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے حق میں پیش کرنے کی ضرورت نہ سمجھی گئی تھی، اُسی طرح اب اس آیت میں بھی کفارِ مکہ کے الزامِ افترا پر صرف اتنی بات ہی کہنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے کہ "یہ حق ہے تیرے رب کی طرف سے"۔ اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر حاشیہ نمبر ا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ کون، کس ماحول میں، کس شان کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہا تھا، یہ سب کچھ سامعین کے سامنے موجود تھا۔ اور یہ کتاب بھی اپنی زبان اور اپنے ادب اور مضامین کے ساتھ سب کے سامنے تھی۔ اور اس کے اثرات و نتائج بھی مکہ کی اُس سوسائٹی میں سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس صورتِ حال میں اس کتاب کا رب العٰلمین کی طرف سے آیا ہوا حق ہونا ایسا صریح امر واقعہ تھا جسے صرف حتمی طور پر بیان کر دینا ہی کفار کے الزام کی تردید کے لیے کافی تھا۔ اس پر کسی استدلال کی کوشش بات کو مضبوط کرنے کے بجائے اُلٹی اسے کمزور کرنے کی موجب ہوتی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت سورج چمک رہا ہو اور کوئی ڈھیٹ آدمی کہے کہ یہ اندھیری رات ہے۔ اس کے

کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا، شاید کہ وہ ہدایت پا جائیں ۵

جواب میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ تم اسے رات کہتے ہو؟ یہ روز روشن تو سامنے موجود ہے۔ اس کے بعد دن کے موجود ہونے پر اگر آپ منطقی دلیلیں قائم کریں گے تو اپنے جواب کے زور میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے بلکہ درحقیقت اس کے زور کو کچھ کم ہی کر دیں گے۔

۵ یعنی جس طرح اس کا حق ہونا اور من جانب اللہ ہونا قطعی و یقینی امر ہے اُسی طرح اس کا مبنی برحکمت ہونا اور خود تم لوگوں کے لیے خدا کی ایک رحمت ہونا بھی ظاہر ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ صدہا برس سے تمہارے اندر کوئی پیغمبر نہیں آیا ہے۔ تم خود جانتے ہو کہ تمہاری ساری قوم جہالت اور اخلاقی پستی اور سخت پسماندگی میں مبتلا ہے۔ اس حالت میں اگر تمہیں بیدار کرنے اور راہ راست دکھانے کے لیے ایک پیغمبر تمہارے درمیان بھیجا گیا ہے تو اس پر حیران کیوں ہوتے ہو۔ یہ تو ایک بڑی ضرورت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے پورا کیا ہے اور تمہاری اپنی بھلائی کے لیے کیا ہے۔

واضح رہے کہ عرب میں دین حق کی روشنی سب سے پہلے حضرت ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے ذریعہ سے پہنچی تھی جو زمانۂ قبل تاریخ میں گزرے ہیں۔ پھر حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام آئے جن کا زمانہ حضورؐ سے ڈھائی ہزار برس قبل گزرا ہے۔ اس کے بعد آخری پیغمبر جو عرب کی سرزمین میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھیجے گئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے اور ان کی آمد پر بھی تقریباً دو ہزار برس گزر چکے تھے۔ یہ اتنی طویل مدت ہے کہ اس کے لحاظ سے یہ کہنا بالکل بجا تھا کہ اس قوم کے اندر کوئی متنبہ کرنے والا نہیں آیا اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس قوم میں کبھی کوئی متنبہ کرنے والا نہ آیا تھا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مدت دراز سے یہ قوم ایک متنبہ کرنے والے کی محتاج چلی آرہی ہے۔

یہاں ایک اور سوال سامنے آجاتا ہے جس کو صاف کر دینا ضروری ہے۔ اس آیت کو پڑھتے ہوئے آدمی کے ذہن میں یہ کھٹک پیدا ہوتی ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے صدہا برس تک

عربوں میں کوئی نبی نہیں آیا تو اس جاہلیت کے دور میں گزرے ہوئے لوگوں سے آخر بازپرس کس بنیاد پر ہوگی؟ انہیں معلوم ہی کب تھا کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا؟ پھر اگر وہ گمراہ تھے تو اپنی اس گمراہی کے ذمہ دار وہ کیسے قرار دیئے جا سکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دین کا تفصیلی علم چاہے اس جاہلیت کے زمانہ میں لوگوں کے پاس نہ رہا ہو، مگر یہ بات اس زمانے میں بھی لوگوں سے پوشیدہ نہ تھی کہ اصل دین توحید ہے اور انبیاء علیہم السلام نے کبھی بت پرستی نہیں سکھائی ہے۔ یہ حقیقت اُن روایات میں بھی محفوظ تھی جو عرب کے لوگوں کو اپنی سرزمین کے انبیاء سے پہنچی تھیں، اور اسے قریب کی سرزمین میں آئے ہوئے انبیاء حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے بھی یہ لوگ جانتے تھے۔ عرب کی روایات میں یہ بات بھی مشہور و معروف تھی کہ قدیم زمانہ میں اہلِ عرب کا اصل دین، دینِ ابراہیمؑ تھا اور بُت پرستی اُن کے ہاں عمرو بن لُحَیّ نامی ایک شخص نے شروع کی تھی۔ شرک و بُت پرستی کے رواجِ عام کے باوجود عرب کے مختلف حصوں میں جگہ جگہ ایسے لوگ موجود تھے جو شرک سے انکار کرتے تھے، توحید کا اعلان کرتے تھے اور بتوں پر قربانیاں کرنے کی علانیہ مذمت کرتے تھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے بالکل قریب زمانے میں قُسّ بن ساعدۃ الایادی، اُمیہ بن ابی الصَّلت، سُوَید بن عمرو المصطلقی، وکیع بن سَلَمہ بن زُہیر الایادی، عمرو بن جُندُب الجُہَنِی، ابوقیس صرمہ بن ابی انس، زید بن عمرو بن نُفَیل، وَرَقہ بن نوفل، عثمان بن الحُوَیرِث، عبیداللہ بن جَحش، عامر بن الظَّرِب العدوانی، علّاف بن شہاب التّمیمی، المتلمّس بن اُمیّۃ الکنانی، زہیر بن ابی سُلمیٰ، خالد بن سنان بن غیث العَبسی، عبداللہ القُضاعی اور ایسے ہی بہت سے لوگوں کے حالات ہمیں تاریخوں میں ملتے ہیں جنہیں حُنَفاء کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سب لوگ علی الاعلان توحید کو اصل دین کہتے تھے اور مشرکین کے مذہب سے اپنی بے تعلقی کا صاف صاف اظہار کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کے ذہن میں یہ تخیّل انبیاء علیہم السلام کی سابقہ تعلیمات کے باقی ماندہ اثرات ہی سے آیا تھا۔ اس کے علاوہ یمن میں چوتھی پانچویں صدی عیسوی کے جو کتبات آثارِ قدیمہ کی جدید تحقیقات کے سلسلے میں برآمد ہوتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس دور میں وہاں ایک

وہ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور اُن ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دنوں میں پیدا کیا اور اس کے بعد عرش پر متمکن ہوا۔ ۷ اُس کے بغیر نہ تمہارا کوئی حامی و مددگار ہے نہ سفارشی، پھر کیا تم ہوش میں نہ آؤ گے؟ ۸ وہ آسمان

توحیدی مذہب موجود تھا جس کے پیرو الرحمان اور رب السماء والارض ہی کو الٰہ واحد تسلیم کرتے تھے۔ ۳۷۸ء کا ایک کتبہ ایک معبد کے کھنڈر سے ملا ہے جس میں لکھا گیا ہے کہ یہ معبد "الٰہ ذوسموی" (الٰہ السماء یا رب السماء) کی عبادت کے لیے بنایا گیا ہے۔ ۴۶۵ء کے ایک کتبے میں بنصر ورد الٰھن بعل سمین وارضین (بنصر وبعون الالٰہ رب السماء والارض) کے الفاظ لکھے ہیں جو عقیدۂ توحید پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اسی دور کا ایک اور کتبہ ایک قبر پر ملا ہے جس میں بخیل رحمنن (یعنی استعین بحول الرحمن) کے الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شمالِ عرب میں دریائے فرات اور قنسرین کے درمیان زَبَد کے مقام پر ۵۱۲ء کا ایک کتبہ ملا ہے جس میں بسم الالٰہ۔ لاعز الاالٰہ۔ لاشکر الا لہٗ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ ساری باتیں بتاتی ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے انبیاء سابقین کی تعلیمات کے آثار عرب سے بالکل مٹ نہیں گئے تھے اور کم از کم اتنی بات یاد دلانے کے لیے بہت سے ذرائع موجود تھے کہ "تمہارا خدا ایک ہی خدا ہے"۔

(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، صفحات ۴٦۴-۴٦۵)

٦ اب مشرکین کے دوسرے اعتراض کو لیا جاتا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ توحید پر کرتے تھے۔ ان کو اس بات پر سخت اعتراض تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دیوتاؤں اور بزرگوں کی معبودیت سے انکار کرتے ہیں اور ہانکے پکارے یہ دعوت دیتے ہیں کہ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی کارساز، کوئی حاجت روا، کوئی دعائیں سننے والا، اور بگڑی بنانے والا، اور کوئی حاکم ذی اختیار نہیں ہے۔

۷ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم ص ۳٦-۲٦۱-۲٦۲-۴۴۱ ۴۴۲-

۸ یعنی تمہارا اصل خدا تو خالقِ زمین و آسمان ہے۔ تم کس خیالِ خام میں مبتلا ہو کہ کائنات کی اس عظیم الشان سلطنت میں اُس کے سوا دوسروں کو کارساز سمجھ بیٹھے ہو۔ اس پوری کائنات کا اور

سے زمین تک دنیا کے معاملات کی تدبیر کرتا ہے اور اس تدبیر کی روداد اوپر اُس کے حضور جاتی ہے ایک ایسے دن میں جس کی مقدار تمہارے شمار سے ایک ہزار سال ہے۔^۹

اس کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کی ذات کے سوا ہر دوسری چیز جو یہاں پائی جاتی ہے، مخلوق ہے۔ اور اللہ اس دنیا کو بنا دینے کے بعد کہیں جا کر سو بھی نہیں گیا ہے۔ بلکہ اپنی اس سلطنت کا تخت نشین اور حاکم و فرمانروا بھی وہ آپ ہی ہے۔ پھر تمہاری عقل آخر کہاں چرنے چلی گئی ہے کہ تم مخلوقات میں سے چند ہستیوں کو اپنی قسمتوں کا مالک قرار دے رہے ہو؟ اگر اللہ تمہاری مدد نہ کرے تو ان میں سے کس کی یہ طاقت ہے کہ تمہاری مدد کر سکے؟ اگر اللہ تمہیں پکڑے تو ان میں سے کس کا یہ زور ہے کہ تمہیں چھڑا سکے؟ اگر اللہ سفارش نہ سنے تو ان میں سے کون یہ بل بوتا رکھتا ہے کہ اس سے اپنی سفارش منوا لے؟

^۹ یعنی تمہارے نزدیک جو ایک ہزار برس کی تاریخ ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں گویا ایک دن کا کام ہے جس کی اسکیم آج کارکنانِ قضا و قدر کے سپرد کی جاتی ہے اور کل وہ اس کی روداد اس کے حضور پیش کرتے ہیں تاکہ دوسرے دن (یعنی تمہارے حساب سے ایک ہزار برس) کا کام ان کے سپرد کیا جائے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون دو مقامات پر اور بھی آیا ہے جنہیں نگاہ میں رکھنے سے اس کا مطلب اچھی طرح سمجھ میں آ سکتا ہے۔ کفارِ عرب کہتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو نبوت کا دعویٰ لیکر سامنے آئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ وہ بار بار ہم سے کہتے ہیں کہ اگر میری اس دعوت کو تم لوگ قبول نہ کرو گے اور مجھے جھٹلا دو گے تو تم پر خدا کا عذاب آ جائیگا۔ مگر کئی برس سے وہ اپنی یہ بات دہرائے جاتے ہیں اور آج تک عذاب نہ آیا، حالانکہ ہم ایک دفعہ نہیں ہزاروں مرتبہ انہیں صاف صاف جھٹلا چکے ہیں۔ ان کی یہ دھمکیاں واقعی سچی ہوتیں تو ہم پر معلوم کبھی کا عذاب آ چکا ہوتا۔ اس پر اللہ تعالیٰ سورۂ حج میں فرماتا ہے:

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ	یہ لوگ عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ
يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ	ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کرے گا مگر

وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا[۱۰]۔ زبردست[۱۱] اور رحیم[۱۲]۔ جو چیز بھی اس نے بنائی خوب ہی بنائی[۱۳]۔ اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی، پھر اُس کی نسل ایک

رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ	تیرے رب کے ہاں کا ایک دن تم لوگوں کے
(آیت ۴۷)	شمار سے ہزار برس جیسا ہوا کرتا ہے۔

دوسری جگہ اسی بات کا جواب یہ دیا جاتا ہے:

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ	پوچھنے والا پوچھتا ہے اُس عذاب کو جو واقع
لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِى	ہونے والا ہے کافروں کے لیے جس کو دفع کرنے
الْمَعَارِجِ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ	والا کوئی نہیں ہے، اُس خدا کی طرف سے جو چڑھتے
اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ	درجوں والا ہے (یعنی درجہ بدرجہ کام کرنے والا)،
اَلْفَ سَنَةٍ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ،	چڑھتے ہیں اس کی طرف ملائکہ اور روح ایک ایسے
اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰهُ قَرِيْبًا۔	دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے۔ پس اے
(المعارج، آیات ۱-۷)	نبی صبر جمیل سے کام لو۔ یہ لوگ اسے دور سمجھتے
	ہیں اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں

ان تمام ارشادات سے جو بات ذہن نشین کرائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں خدا کے فیصلے دنیا کی گھڑیوں اور جنتریوں کے لحاظ سے نہیں ہوتے۔ کسی قوم سے اگر یہ کہا جائے کہ تم فلاں روش اختیار کرو گے تو اس کا انجام تمہیں یہ کچھ دیکھنا ہوگا، تو وہ قوم سخت احمق ہوگی اگر اس کا یہ مطلب سمجھے کہ آج وہ روش اختیار کی جائے اور کل اس کے بُرے نتائج سامنے آجائیں۔ ظہورِ نتائج کے لیے دن اور مہینے اور سال تو کیا چیز ہیں، صدیاں بھی کوئی بڑی مدت نہیں ہیں۔

[۱۰] یعنی دوسرے جو بھی ہیں ان کے لیے ایک چیز ظاہر ہے تو بے شمار چیزیں ان سے پوشیدہ ہیں۔ فرشتے ہوں یا جن، یا نبی اور ولی اور برگزیدہ انسان، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو سب کچھ جاننے والا ہو۔ یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے کہ اس پر ہر چیز عیاں ہے۔ جو کچھ گزر

ایسے ست سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح کا ہے[۱۴]، پھر اس کو نک سک سے

چکا ہے، جو کچھ موجود ہے اور جو کچھ آنے والا ہے، سب اس پر روشن ہے۔

[۱۱] یعنی ہر چیز پر غالب۔ کائنات میں کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے اور اس کے حکم کو نافذ ہونے سے روک سکے۔ ہر شے اس سے مغلوب ہے اور کسی میں اس کے مقابلے کا بل بوتا نہیں ہے۔

[۱۲] یعنی اس غلبے اور قوتِ قاہرہ کے باوجود وہ ظالم نہیں ہے بلکہ اپنی مخلوق پر رحیم و شفیق ہے۔

[۱۳] یعنی اس عظیم الشان کائنات میں اس نے بے حد و حساب چیزیں بنائی ہیں، مگر کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو بے ڈھنگی اور بے تکی ہو۔ ہر شے اپنا ایک الگ حسن رکھتی ہے۔ ہر شے اپنی جگہ متناسب اور موزوں ہے۔ جو چیز جس کام کے لیے بھی اس نے بنائی ہے اس کے لیے موزوں ترین شکل پر، مناسب ترین صفات کے ساتھ بنائی ہے۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سننے کے لیے کان کی ساخت سے زیادہ موزوں کسی ساخت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ ہوا اور پانی جن مقاصد کے لیے بنائے گئے ہیں ان کے لیے ہوا ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی ہونی چاہیے، اور پانی وہی اوصاف رکھتا ہے جیسے ہونے چاہئیں۔ تم خدا کی بنائی ہوئی کسی چیز کے نقشے میں کسی کوتاہی کی نشان دہی نہیں کر سکتے، نہ اس میں کوئی ترمیم پیش کر سکتے ہو۔

[۱۴] یعنی پہلے اس نے براہِ راست اپنے تخلیقی عمل (DIRECT CREATION) سے انسان کو پیدا کیا، اور اس کے بعد خود اسی انسان کے اندر تناسل کی وہ طاقت رکھ دی کہ اس کے نطفے سے ویسے ہی انسان پیدا ہوتے چلے جائیں۔ ایک کمال یہ تھا کہ زمین کے مواد کو جمع کر کے ایک تخلیقی حکم سے اس میں وہ زندگی اور وہ شعور و تعقل پیدا کر دیا جس سے انسان جیسی ایک حیرت انگیز مخلوق وجود میں آ گئی۔ اور دوسرا کمال یہ ہے کہ آئندہ مزید انسانوں کی پیدائش کے لیے ایک ایسی عجیب مشینری خود انسانی ساخت کے اندر رکھ دی جس کی ترکیب اور کارگزاری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

درست[15] کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی[16]، اور تم کو کان دیے، آنکھیں دیں اور

یہ آیت قرآن مجید کی اُن آیات میں سے ہے جو انسانِ اوّل کی براہِ راست تخلیق کی تصریح کرتی ہیں۔ ڈارون کے زمانہ سے سائنس داں حضرات اس تصور پر بہت ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بڑی حقارت کے ساتھ وہ اسکو ایک غیر سائنٹفک نظریہ قرار دے کر گویا پھینک دیتے ہیں لیکن انسان کی نہ سہی، تمام انواعِ حیوانی کی نہ سہی، اوّلین جرثومۂ حیات کی براہِ راست تخلیق سے تو وہ کسی طرح پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ اس تخلیق کو نہ مانا جائے تو پھر یہ انتہائی لغو بات ماننی پڑیگی کہ زندگی کی ابتدا محض ایک حادثہ کے طور پر ہوئی ہے، حالانکہ صرف ایک خلیہ (CELL) والے حیوان میں زندگی کی سادہ ترین صورت بھی اتنی پیچیدہ اور نازک حکمتوں سے لبریز ہے کہ اسے حادثہ کا نتیجہ قرار دینا اُس سے لاکھوں درجہ زیادہ غیر سائنٹفک بات ہے جتنا نظریۂ ارتقاء کے قائلین نظریۂ تخلیق کو ٹھیراتے ہیں۔ اور اگر ایک دفعہ آدمی یہ مان لے کہ حیات کا پہلا جرثومہ براہ راست تخلیق سے وجود میں آیا تھا، تو پھر آخر یہی ماننے میں کیا قباحت ہے کہ ہر نوعِ حیوانی کا پہلا فرد خالق کے تخلیقی عمل سے پیدا ہوا ہے، اور پھر اس کی نسل تناسل (PROCREATION) کی مختلف صورتوں سے چلی ہے۔ اس بات کو مان لینے سے وہ بہت سی گتھیاں حل ہو جاتی ہیں جو ڈارونیت کے علمبرداروں کی ساری سائنٹفک شاعری کے باوجود ان کے نظریۂ ارتقاء میں غیر حل شدہ رہ گئی ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحات ۲۵۹ - ۳۱۹ - ۵۶۶ - جلد دوم، صفحات ۱۰ - ۱۱ - ۱۰۶ - ۵۰۴ - جلد سوم، صفحات ۲۰۱ - ۲۶۹)

[15] یعنی ایک انتہائی باریک خوردبینی وجود سے بڑھا کر اسے پوری انسانی شکل تک پہنچایا اور اس کا جسم سارے اعضاء و جوارح کے ساتھ مکمل کر دیا۔

[16] روح سے مراد محض وہ زندگی نہیں ہے جس کی بدولت ایک ذی حیات جسم کی مشین متحرک ہوتی ہے، بلکہ اس سے مراد وہ خاص جوہر ہے جو فکر و شعور اور عقل و تمیز اور فیصلہ و اختیار کا حامل ہوتا ہے، جس کی بدولت انسان تمام دوسری مخلوقاتِ ارضی سے ممتاز ایک صاحبِ شخصیت ہستی

دل دیئے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو[۱۸]

صاحبِ اَنا ہستی، اور حاملِ خلافت ہستی بنتا ہے۔

اِس روح کو اللہ تعالیٰ نے اپنی روح یا تو اس معنی میں فرمایا ہے کہ وہ اُسی کی مِلک ہے اور اس کی ذاتِ پاک کی طرف اس کا انتساب اُسی طرح کا ہے جس طرح ایک چیز اپنے مالک کی طرف منسوب ہو کر اُس کی چیز کہلاتی ہے۔ یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر علم، فکر، شعور، ارادہ، فیصلہ، اختیار اور ایسے ہی دوسرے جو اوصاف پیدا ہوتے ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ ان کا سرچشمہ مادّے کی کوئی ترکیب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ کے علم سے اس کو علم ملا ہے، اللہ کی حکمت سے اس کو دانائی ملی ہے، اللہ کے اختیار سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہ اوصاف کسی بے علم، بے دانش اور بے اختیار ماخذ سے انسان کے اندر نہیں آتے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، صفحات ۵۰۴ - ۵۰۵)۔

۱۸؎ یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ روح پھونکنے سے پہلے انسان کا سارا ذکر صیغۂ غائب میں کیا جاتا رہا: "اس کی تخلیق کی"، "اس کی نسل چلائی"، "اس کو نِک سُک سے درست کیا"، "اس کے اندر روح پھونکی"۔ اس لیے کہ اس وقت تک وہ خطاب کے لائق نہ تھا۔ پھر جب روح پھونک دی گئی تو اب اس سے فرمایا جا رہا ہے کہ "تم کو کان دیئے"، "تم کو آنکھیں دیں"، "تم کو دل دیئے"۔ اس لیے کہ حاملِ رُوح ہو جانے کے بعد ہی وہ اس قابل ہوا کہ اسے مخاطب کیا جائے۔

کان اور آنکھوں سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ حصولِ علم کے ذرائع ذائقہ اور لامسہ اور شامّہ بھی ہیں، لیکن سماعت و بینائی تمام دوسرے حواس سے زیادہ بڑے اور اہم ذرائع ہیں، اس لیے قرآن جگہ جگہ انہی دو کو خدا کے نمایاں عطیوں کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد "دل" سے مراد وہ ذہن (MIND) ہے جو حواس کے ذریعہ سے حاصل شدہ معلومات کو مرتب کر کے ان سے نتائج نکالتا ہے اور عمل کی مختلف امکانی راہوں میں سے کوئی ایک راہ منتخب کرنا اور اس پر چلنے کا فیصلہ کرتا ہے۔

اور[19] یہ لوگ کہتے ہیں: "جب ہم مٹی میں رَل مِل چکے ہونگے تو کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" اصل بات یہ ہے کہ یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں[20]۔ اِن سے کہو "موت کا وہ فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تم کو پورا کا پورا

[18] یعنی یہ عظیم القدر انسانی رُوح اتنے بلند پایہ اوصاف کے ساتھ تم کو اس لیے تو عطا نہیں کی گئی تھی کہ تم دنیا میں جانوروں کی طرح رہو اور اپنے لیے بس وہی زندگی کا نقشہ بنالو جو کوئی حیوان بنا سکتا ہے۔ یہ آنکھیں تمہیں چشمِ بصیرت سے دیکھنے کے لیے دی گئی تھیں نہ کہ اندھے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ کان تمہیں گوشِ ہوش سے سننے کے لیے دیئے گئے تھے نہ کہ بہرے بن کر رہنے کے لیے۔ یہ دل تمہیں اس لیے دیئے گئے تھے کہ حقیقت کو سمجھو اور صحیح راہِ فکر و عمل اختیار کرو، نہ اس لیے کہ اپنی ساری صلاحیتیں صرف اپنی حیوانیت کی پرورش کے وسائل فراہم کرنے میں صرف کردو، اور اس سے کچھ اونچے اٹھو تو اپنے خالق سے بغاوت کے فلسفے اور پروگرام بنانے لگو۔ یہ بیش قیمت نعمتیں خدا سے پانے کے بعد جب تم دہریت یا شرک اختیار کرتے ہو، جب تم خود خدا یا دوسرے خداؤں کے بندے بنتے ہو، جب تم خواہشات کے غلام بن کر جسم و نفس کی لذتوں میں غرق ہوجاتے ہو، تو گویا اپنے خدا سے یہ کہتے ہو کہ ہم ان نعمتوں کے لائق نہ تھے، ہمیں انسان بنانے کے بجائے تجھے ایک بندر، یا ایک بھیڑیا، یا ایک مگرمچھ یا ایک کوّا بنانا چاہیے تھا۔

[19] رسالت اور توحید پر کفار کے اعتراضات کا جواب دینے کے بعد اب اسلام کے تیسرے بنیادی عقیدے، یعنی آخرت پر اُن کے اعتراض کو لیکر اس کا جواب دیا جاتا ہے۔ آیت میں وَقَالُوۤا کا واو عطف مضمونِ ماسبق سے اس پیراگراف کا تعلق جوڑتا ہے۔ گویا ترتیبِ کلام یوں ہے کہ "وہ کہتے ہیں محمدؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں"، "وہ کہتے ہیں اللہ معبودِ واحد نہیں ہے"، اور "وہ کہتے ہیں کہ ہم مر کر دوبارہ نہ اٹھیں گے"۔

[20] اوپر کے فقرے اور اس فقرے کے درمیان پوری ایک داستان کی داستان ہے جسے سامع کے ذہن پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کفار کا جو اعتراض پہلے فقرے میں نقل کیا گیا ہے وہ اتنا مہمل ہے

اع اپنے قبضے میں لے لیگا اور پھر تم اپنے رب کی طرف پلٹا لائے جاؤ گے ؏

کہ اس کی تردید کی حاجت محسوس نہیں کی گئی۔ اس کا محض نقل کر دینا ہی اس کی لغویت ظاہر کرنے کے لیے کافی سمجھا گیا۔ اس لیے کہ ان کا اعتراض جن دو اجزاء پر مشتمل ہے وہ دونوں ہی سراسر غیر معقول ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ "ہم مٹی میں رل مل چکے ہونگے" آخر کیا معنی رکھتا ہے؟ "ہم" جس چیز کا نام ہے وہ کب مٹی میں رلتی ملتی ہے؟ مٹی میں تو صرف وہ جسم ملتا ہے جس سے "ہم" نکل چکا ہوتا ہے! اس جسم کا نام "ہم" نہیں ہے۔ زندگی کی حالت میں جب اس جسم کے اعضا کاٹے جاتے ہیں تو عضو پر عضو کٹتا چلا جاتا ہے مگر "ہم" پورا کا پورا اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ اس کا کوئی جزء بھی کسی کٹے ہوئے عضو کے ساتھ نہیں جاتا۔ اور جب یہ "ہم" کسی جسم میں سے نکل جاتا ہے تو پورا جسم موجود ہوتے ہوئے بھی اس پر اس "ہم" کے کسی ادنیٰ شائبے تک کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اسی لیے تو ایک عاشقِ جاں نثار اپنے معشوق کے مردہ جسم کو لے جا کر دفن کر دیتا ہے، کیونکہ معشوق اس جسم سے نکل چکا ہوتا ہے اور وہ معشوق کو نہیں بلکہ اس خالی جسم کو دفن کرتا ہے جس میں کبھی اس کا معشوق رہتا تھا۔ پس معترضین کے اعتراض کا پہلا مقدمہ ہی بے بنیاد ہے۔ رہا اس کا دوسرا جزء "کیا ہم پھر نئے سرے سے پیدا کیے جائیں گے؟" تو یہ انکار و تعجب کے انداز کا سوال سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا اگر معترضین نے بات کرنے سے پہلے اس "ہم" اور اس کے پیدا کیے جانے کے مفہوم پر ایک لمحہ کے لیے کچھ غور کر لیا ہوتا۔ اس "ہم" کی موجودہ پیدائش اس کے سوا کیا ہے کہ کہیں سے کوئلہ اور کہیں سے لوہا اور کہیں سے چونا اور اسی طرح کے دوسرے اجزاء جمع ہوئے اور اس کالبدِ خاکی میں یہ "ہم" براجمان ہو گیا۔ پھر اس کی موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اس کالبدِ خاکی میں سے جب "ہم" نکل جاتا ہے تو اس کا مکان تعمیر کرنے کے لیے جو اجزاء زمین کے مختلف حصوں سے فراہم کیے گئے تھے وہ سب اسی زمین میں واپس چلے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جس نے پہلے اس "ہم" کو یہ مکان بنا کر دیا تھا، کیا وہ دوبارہ اسی سر و سامان سے وہی مکان بنا کر اسے از سرِ نو اس میں نہیں بسا سکتا؟ یہ چیز جب پہلے ممکن تھی اور واقعہ کی صورت میں رونما ہو چکی ہے، تو دوبارہ اس کے ممکن ہونے اور واقعہ بننے میں

آخر کیا امر مانع ہے؟ یہ باتیں ایسی ہیں جنہیں ذرا سی عقل آدمی استعمال کرے تو خود ہی سمجھ سکتا ہے۔ لیکن وہ اپنی عقل کو اس رُخ پر کیوں نہیں جانے دیتا؟ کیا وجہ ہے کہ وہ بے سوچے سمجھے حیات بعد الموت اور آخرت پر اس طرح کے لایعنی اعتراضات جڑتا ہے؟ بیچ کی ساری بحث چھوڑ کر اللہ تعالیٰ دوسرے فقرے میں اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ "دراصل یہ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں" یعنی اصل بات یہ نہیں ہے کہ دوبارہ پیدائش کوئی بڑی ہی انوکھی اور بعید از امکان بات ہے جو ان کی سمجھ میں نہ آسکتی ہو، بلکہ دراصل جو چیز انہیں یہ بات سمجھنے سے روکتی ہے وہ ان کی یہ خواہش ہے کہ ہم زمین میں چھوٹے پھریں اور دل کھول کر گناہ کریں اور پھر بلوہ (SCOT FREE) یہاں سے نکل جائیں۔ پھر ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہو۔ پھر اپنے کرتوتوں کا کوئی حساب ہمیں دینا پڑے۔

۱۲؎ یعنی تمہارا وہ "ہم" مٹی میں رل مل نہ جائے گا، بلکہ اس کی مہلتِ عمل ختم ہوتے ہی خدا کا فرشتۂ موت آئے گا اور اسے جسم سے نکال کر سموچا اپنے قبضے میں لے لیگا، اس کا کوئی ادنیٰ سا جُز بھی جسم کے ساتھ مٹی میں نہ جاسکے گا، وہ پُورا کا پورا حراست (CUSTODY) میں لے لیا جائے گا اور اپنے رب کے حضور پیش کر دیا جائے گا۔

اس مختصر سی آیت میں بہت سے حقائق پر روشنی ڈالی گئی ہے جن پر سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے:

(۱) اس میں تصریح ہے کہ موت کچھ یونہی نہیں آجاتی کہ ایک گھڑی چل رہی تھی، کوک ختم ہوئی اور وہ چلتے چلتے یکایک بند ہو گئی۔ بلکہ دراصل اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص فرشتہ مقرر کر رکھا ہے جو آکر باقاعدہ روح کو ٹھیک اُسی طرح وصول کرتا ہے جس طرح ایک سرکاری امین (OFFICIAL RECIEVER) کسی چیز کو اپنے قبضے میں لیتا ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات پر اس کی مزید تفصیلات جو بیان کی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس افسرِ موت کے ماتحت فرشتوں کا ایک پورا عملہ ہے جو موت وارد کرنے اور روح کو جسم سے نکالنے اور اس کو قبضے میں لینے کی بہت سی مختلف النوع خدمات انجام دیتا ہے۔ نیز یہ کہ اس عملے کا

برتاؤ مجرم روح کے ساتھ کچھ اور ہوتا ہے اور مومن صالح روح کے ساتھ کچھ اور۔ (ان تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سورہ نساء، آیت ۹۷- الانعام، ۹۳- النحل، ۲۸، الواقعہ ۸۳-۹۴)۔

(۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت سے انسان معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح جسم سے نکل کر باقی رہتی ہے۔ قرآن کے الفاظ "موت کا فرشتہ تم کو پورا کا پورا اپنے قبضے میں لے لیگا" اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ کوئی معدوم چیز قبضے میں نہیں لی جاتی۔ قبضے میں لینے کا تو مطلب ہی یہ ہے کہ مقبوضہ چیز قابض کے پاس رہے۔

(۳) اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت جو چیز قبضے میں لی جاتی ہے وہ آدمی کی حیوانی زندگی (BIOLAGICAL LIFE) نہیں بلکہ اس کی وہ خودی، اس کی وہ انا (EGO) ہے جو "میں" اور "ہم" اور "تم" کے الفاظ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہ انا دنیا میں کام کر کے جیسی کچھ شخصیت بھی بنتی ہے وہ پوری کی پوری جوں کی توں (INTACT) نکال لی جاتی ہے بغیر اس کے کہ اس کے اوصاف میں کوئی کمی بیشی ہو۔ اور یہی چیز موت کے بعد اپنے رب کی طرف پلٹائی جاتی ہے۔ اسی کو آخرت میں نیا جنم اور نیا جسم دیا جائے گا، اسی پر مقدمہ قائم کیا جائے گا۔ اسی سے حساب لیا جائے گا، اور اسی کو جزا و سزا دیکھنی ہوگی۔

فرعون و کلیمؑ کی داستانِ کشمکش

قرآن کے بیان کردہ چند پہلوؤں کا سرسری مطالعہ

از ڈاکٹر سعید رمضان صاحب

فرعونِ موسیٰ | "فرعون" مصری تاریخ کا مشہور و معروف کردار ہے۔ اہلِ مصر اس نام کو اپنے حکام اور فرمانرواؤں کے لیے بطورِ لقب استعمال کرتے تھے، جس طرح رومی سلاطین کو "قیصرِ روم" اور ایرانی تاجداروں کو "کسرائے ایران" کہا جاتا تھا۔ اسی طرح مصر کے اربابِ اقتدار "فرعون" کہلاتے تھے۔

مصر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں جس فرعون کی حکمرانی تھی قرآن کریم نے اس کا اصل نام ظاہر نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف لقب پر اکتفا کیا ہے۔ تاریخی اور اثری تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کا نام منفتاح تھا۔ قرآن نے صرف اس کی وہ صفات اور کارگزاریاں تفصیل سے بیان کر دی ہیں جن کی وجہ سے وہ لعنتِ خداوندی کا سزاوار قرار پایا ہے۔ چنانچہ قرآن کے اس اسلوبِ بیان کی وجہ سے "فرعون" کا لفظ ایک لیبل بن گیا ہے جس کے پیچھے اس نام کی کوئی مخصوص تاریخی شخصیت مراد نہیں ہوتی بلکہ اصل مقصد فرعونی صفات و اعمال ہیں۔ انہی صفات و اعمال کے مجموعہ کو اہلِ تفسیر زمان و مکان کے تعین کے بغیر فرعون سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔

فرعون کا اصل نام بیان نہ کرنے کی وجہ | یہاں یہ سوال وارد ہو سکتا ہے کہ قرآن نے موسیٰ کا تو نام بیان کر دیا مگر فرعون کا نام کیوں نہیں واضح کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے خود منتخب فرمایا اور انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ اللہ کے

رسول مثالی نمونہ ہوتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ خاص طور پر انسانوں کے لیے تیار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ جن صفات و اعمال کے حامل ہوتے ہیں وہ اُن کی منفرد اور یکتا خصوصیات ہوتی ہیں اور عام انسان اِن خصوصیات میں اُن کے تابع ہوتے ہیں۔ نیز گروہِ انبیاء طویل بشری تاریخ میں چند نفوس پر مشتمل رہا ہے۔ اس لیے پیغمبروں کے نام مع منصب واضح کر دیئے جاتے ہیں لیکن حضرت موسیٰ کے بالمقابل جو فرعون تھا، وہ ایک ایسا فرمانروا تھا جسے اہلِ مصر نے اپنی رضامندی سے قبول کر رکھا تھا یا اُس نے خود اپنے آپ کو اہلِ مصر پر مسلط کر رکھا تھا اور یہ دونوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان کی مثالیں تاریخ میں کثرت سے ملتی ہیں اور بار بار تاریخ کے اسٹیج پر ان کا اعادہ ہوتا رہا ہے۔

اس طرح ہمیں ایک قدیم اعتراض کا جواب بھی مل جاتا ہے یعنی قرآن میں موسیٰ اور فرعون کا قصہ بکثرت سورتوں میں بار بار کیوں دُہرایا گیا ہے۔ دراصل تکرارِ داستان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ فرعونی کردار بار بار جلوہ گاہِ تاریخ پر اُبھرے گا۔ اس لیے لازم ہے کہ ہر فرعونی کردار کے مقابلے میں موسوی شخصیت علمبردارِ حق کے لباس میں نمودار ہو جائے اور "ہر فرعونے را موسیٰ" کا اصول جاری و ساری رہے۔

غیر مساوی طاقتوں کا تصادم | فرعون و کلیم کی داستانِ کشمکش میں قرآن یہ پہلو خاص طور پر اُجاگر کرتا ہے کہ مادی و ظاہری وسائل کے لحاظ سے یہ ٹکر بالکل بے جوڑ تھی۔ قرآن کا بیان ہے کہ: "موسیٰ پر اُس کی قوم میں سے چند نوجوانوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا، فرعون کے ڈر سے اور خود اپنی قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے ڈر سے (جنھیں خوف تھا کہ) فرعون ان کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ اور فرعون ملک میں غلبہ رکھتا تھا اور وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو کسی حد پر نہیں رُکتے ہیں" (یونس: ۸۳) ——— یعنی ایک طرف موسیٰ کے لشکر میں گنتی کے چند نوجوان اور (آیت مذکورہ کے ایک دوسرے مفہوم کے مطابق) وہ نوجوان بھی فرعون اور اس کے حاشیہ برداروں کی دارو گیر سے ترساں و لرزاں۔ دوسری جانب دبدبۂ فرعون کا یہ عالم کہ ایک ملک

اُس کے آگے سرنگوں، کسی کو یارائے دم زدن نہیں، سرکشی حد سے متجاوز۔

دعوتِ حق کے مقابلے میں فرعون کے ہتھکنڈے آمرانہ استکبار و تشدد کی اس گھٹاٹوپ فضا میں معرکۂ فرعون و کلیم کا آغاز ہوا۔ اس معرکہ میں فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو زک پہنچانے کے لیے ہر طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ قرآن کریم جگہ جگہ ان ہتھکنڈوں کی نشاندہی کرتا ہے مثلاً

آمرانہ تشدد و تفلسف کا استعمال فرعون نے اپنے پرہیبت اقتدار اور طنطنۂ آمریت کے بل بوتے پر موسیٰ کی مسکین اور نہتی قوم کے سامنے تہدید آمیز بیانات دیئے اور ان میں اپنے آپ کو ملک کا واحد مالک اور بہی خواہ قرار دیا۔ اُس نے کہا: "اے اہلِ دربار، میں تو اپنے سوا تمہارے کسی خدا کو نہیں جانتا۔ ہامان! ذرا اینٹیں پکوا کر میرے لیے ایک اونچی عمارت تو بنوا، شاید کہ اس پر چڑھ کر میں موسیٰ کے خدا کو دیکھ سکوں، میں تو اسے جھوٹا سمجھتا ہوں" (القصص: ۳۸-۳۹)۔ اُس نے اپنے آپ کو شہریوں کے دل و دماغ کا واحد اجارہ دار ٹھہرایا اور اپنے "عقلِ کُل" ہونے کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ اُس نے لوگوں کو متنبہ کیا کہ اس کی اجازت کے بغیر نہ وہ دوسرے کسی نظریے کے قائل ہو سکتے ہیں اور نہ اُس کی رائے اور تجویز کے خلاف کسی دوسری رائے اور تجویز کو قبول کر سکتے ہیں۔ ایسی حرکت کرنے والوں کے خلاف اُس نے سخت ترین ریگولیشن جاری کیے۔ چنانچہ جب جادوگر حضرت موسیٰ کے مقابلے میں شکست کھا گئے اور آپؑ پر فوراً ایمان لے آئے تو فرعون نے غضبناک ہو کر کہا: "تم موسیٰ کی بات مان گئے، قبل اس کے کہ میں تمہیں اجازت دیتا! ضرور یہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے۔ اچھا، ابھی تمہیں معلوم ہوا جاتا ہے۔ میں تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور تم سب کو سولی چڑھا دوں گا" (الشعراء: ۴۹)۔ بلکہ اُس کے دماغ میں استکبار کی ہوا یہاں تک بھر گئی کہ وہ یہ سمجھنے لگ گیا کہ مصر اور اہلِ مصر میری شخصی جاگیر ہیں، میں ان میں جس طرح چاہوں تصرف کر سکتا ہوں اور جس کے ساتھ جو چاہوں سلوک کر سکتا ہوں وہ کہنے لگا "اے قوم، کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں ہے اور یہ نہریں میرے تحت جاری نہیں ہیں"؟ (الزخرف: ۵۱)۔

قومی تعصبات کا سہارا اُس نے قبطیوں کے قومی تعصب اور وطن پرستی کے جذبات کو اپیل کیا: تاکہ انہیں موسیٰؑ اور ان کی قوم (بنی اسرائیل) کے خلاف بھڑکا دے۔ اُس نے جادوگروں کو دھمکی دیتے ہوئے فوراً سیاسی انقلاب کے خطرے کی گھنٹی بجائی اور کہا: "یقیناً یہ کوئی خفیہ سازش ہے جو تم لوگوں نے اس دارالسلطنت میں کی ہے تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے بے دخل کر دو" (الاعراف: ۱۲۳) فرعون کے اس "انکشافِ سازش" کے بیان پر اس کے حاشیہ بر داروں نے بھی تائیدی بیانات دیئے: "قومِ فرعون کے سرداروں نے کہا کہ "یقیناً یہ شخص بڑا ماہر جادوگر ہے، تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔" (الاعراف: $\frac{۱۱۰}{۱۰۹}$)

اہلِ حق پر سنسنی خیز الزامات کی بوچھاڑ اُس نے افترا پردازی اور تہمت تراشی کا اسلوب اختیار کیا۔ اور حضرت موسیٰ پر سنسنی خیز الزامات چسپاں کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ایک الزام یہ لگایا کہ موسیٰ ملک کے اندر بدامنی اور انتشار پھیلا رہا ہے۔ وہ مصریوں کو چوکنا کرتے ہوئے کہنے لگا: "میں ڈرتا ہوں کہ یہ شخص تم لوگوں کا دین بدل ڈالے گا یا ملک میں فساد برپا کرے گا" (المومن: ۲۶) وزراء اور اہلِ دربار نے بھی سرکارِ عالی مدار کی ہمنوائی کی اور عرض کیا: "کیا حضور موسیٰ اور اُس کی قوم کو یونہی چھوڑ دیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں" (اعراف: ۱۲۷) دوسرا الزام یہ دھرا کہ موسیٰ اقتدار کا بھوکا ہے اور اس کی ساری تگ و دو مسندِ حکومت پر قبضہ جمانے کے لیے ہے۔" فرعون اپنے گرد و پیش کے سرداروں سے بولا: یہ شخص یقیناً ماہر جادوگر ہے، چاہتا ہے کہ اپنے جادو کے زور سے تم کو تمہارے ملک سے نکال دے" (الشعراء: $\frac{۳۵}{۳۴}$) درباریوں نے بھی کہا: "(اے موسیٰ!) کیا تو اس لیے آیا ہے کہ ہمیں اُس طریقے سے پھیر دے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے اور ملک میں اقتدار کی زمام تم دونوں (یعنی موسیٰ اور ہارون) کے ہاتھ آجائے" (یونس: ۷۸)۔ بالآخر فرعون نے اپنے اعوان و انصار اور فوجوں کو جمع کیا اور اُن کو آگاہ کیا کہ موسیٰ اور اس کی قوم ایک ادنیٰ سی جماعت ہے، گنتی کے چند افراد اُس کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، لیکن یہ لوگ امنِ عامہ میں خلل انداز ہو رہے ہیں، تشدد اور لاقانونیت

پر اُتر سے ہوئے ہیں، شہریوں کے پُر سکون چشمۂ حیات کو انہوں نے مکدر کر رکھا ہے، اس لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہے۔ قرآن کا بیان ہے: "فرعون نے دولتِ فرعونیہ کے سرکردہ لوگ جمع کرنے کے لیے شہروں میں نقیب بھیجے اور کہلا بھیجا کہ" یہ کچھ مٹھی بھر لوگ ہیں اور انہوں نے ہم کو بہت ناراض کیا ہے اور ہم ایک ایسی جماعت ہیں جس کا شیوہ ہر وقت چوکنا رہنا ہے" (الشعراء ۵۳-۵۶)۔ "چوکنا رہنا ہے" حاذرون کا ترجمہ ہے۔ سلف میں سے ایک گروہ نے اس کو حَذِرُوْنَ بھی پڑھا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہم ہر وقت اسلحہ سے لیس رہتے ہیں"۔ اس لیے سرکار چاہتی ہے کہ موسیٰ کی بالکلیہ بیخ کنی کر دی جائے اور ان لوگوں کے تمام اڈے فنا کر دیئے جائیں"۔ (ابن کثیر: ج ۳: ص ۳۳۵)۔

"ماہرین فنون" سے زک پہنچانے کی تدابیر | حضرت موسیٰ کی ہوا اکھاڑنے اور ان کے مشن کو مجروح کرنے کا حربہ استعمال کیا۔ چنانچہ اس غرض کے لیے فرعون نے اربابِ دانش اور ماہرین فنون کی خدمات حاصل کیں تاکہ وہ اپنے فن کے ذریعے موسیٰ کے موقف کو بے وزن اور بے بنیاد ثابت کریں۔ مصر میں اس وقت جس نوع کے فن کو عروج حاصل تھا اور لوگوں کے ذہنوں پر اُس کا سحر تھا وہ جادوگری کا فن تھا۔ فرعون نے ایک مقررہ دن کو بڑے بڑے سیانے جادوگروں کو جمع کیا اور انہیں اونچے مناصب، انعام واکرام، اور تقربِ شاہی کا لالچ دیا۔ جادوگروں نے مجمع عام میں اپنے فن کا مظاہرہ کر کے موسیٰ علیہ السلام کو مرعوب کرنا چاہا۔ قرآن کے الفاظ میں: "انہوں نے جو اپنے انچھر پھینکے تو نگاہوں کو مسحور اور دلوں کو خوفزدہ کر دیا اور بڑا ہی زبردست جادو بنا لائے" (الاعراف ۱۱۶) عام حاضرین کچھ دیر کے لیے ان کے جادو سے مبتلائے فتنہ ہو گئے حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی کچھ متاثر ہو گئے: "یکایک اُن کے سحر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یوں محسوس ہوا کہ ان کی رسیاں اور لاٹھیاں دوڑی چلی آ رہی ہیں، اس سے حضرت موسیٰ اپنے دل میں ڈر سے گئے" (طٰہٰ)۔

بہیمیت کی انتہا | مذکورۂ بالا ہتھکنڈوں کے علاوہ، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مقابلے میں تشدد، سخت گیری، کشت و خون اور ہر اس سفاکانہ حربے کو استعمال کیا جسے وہ نشۂ

اقتدار میں بدمست ہو کر کر سکتا تھا۔ اُس نے بنی اسرائیل کے نومولود بیٹوں کے قتل کے احکام جاری کیے اور کہا: میں اُن کے بیٹوں کو قتل کراؤں گا اور اُن کی عورتوں کو جیتا رہنے دوں گا۔ ہمارے اقتدار کی گرفت اُن پر مضبوط ہے" (الاعراف: ۱۲۷)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اُس نے خاص طور پر متنبہ کیا اور ان کو تختۂ دار پر کھنچوا دینے کی دھمکی دی: "اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنایا تو میں تجھے سولی چڑھا دوں گا (الشعراء: ۲۹)

بعثت سے قبل حضرت موسیٰ کے جذبات | یہ تھی وہ نازک اور تاریک فضا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام آزادی کی جنگ لڑتے رہے اور اعلائے کلمۃ اللہ کا مشن انجام دیتے رہے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثت سے قبل ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے جبر و استبداد سے بیزار ہو چکے تھے۔ اور اپنی ستم رسیدہ اور گرفتارِ عذاب قوم کے حالات پر کڑھتے رہتے تھے۔ چنانچہ اُن کی بیزاری اور قلبی اضطراب کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اسرائیلی اور قبطی کی باہمی کشمکش میں اپنی فطری بصیرت و حکمت کے تقاضے کے بموجب اسرائیلی کی فریاد رسی کی اور قبطی کو ایک گھونسا رسید کیا جس سے وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ قرآنِ کریم وضاحت کرتا ہے کہ: "جب موسیٰؑ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشو ونما مکمل ہو گیا تو ہم نے اُسے حکم (حکمت و فراست) اور علم عطا کیا، ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں (ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جب کہ اہلِ شہر غفلت میں تھے وہاں اُس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اُس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا، موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا۔ ۔ ۔ ۔" (القصص: ۱۴-۱۵)۔ حضرت موسیٰ فوراً اپنی اس حرکت پر نادم ہوئے اور اللہ سے مغفرت طلب کی۔ چنانچہ اللہ نے اُن کی مغفرت فرما دی اور اُن کا پردہ ڈھانک دیا)۔ دوسرے روز جب حضرت موسیٰؑ ڈرتے اور خطرہ بھانپتے ہوئے نکلے تو اُن کے پاس یہ اطلاع پہنچی کہ حکام اُن کے قتل کے مشورے کر رہے ہیں: "ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا "موسیٰ! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے

ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں، یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اُس نے دُعا کی کہ" اے میرے رب، مجھے ظالموں سے بچا" (القصص: ۲۰-۲۱)۔

بعثت کے ساتھ ہی فرعون کا سامنا کرنے کا حکم اللہ نے حضرت موسیٰ کی دُعا قبول کی اور اُن کو ظالموں کی گرفت سے بچا لیا۔ حضرت موسیٰ مدین چلے گئے اور کچھ مدت وہاں رہنے کے بعد اپنے اہل و عیال کو لے کر نکل کھڑے ہوئے اور طور کی دائیں سمت پہنچ گئے۔ وہاں جب مبارک خطے میں داخل ہوئے تو ندا آئی کہ" اے موسیٰ، میں ہی اللہ ہوں، سارے جہان والوں کا مالک" (القصص: ۳۰) گویا اب اللہ کی طرف سے اُن کے کندھوں پر رسالت کے فرائض ڈال دیئے گئے اور حکم ہوا کہ فرعون اور اس کی قوم کے پاس جا اور انہیں صاف طور پر حق کی دعوت پیش کر۔ "اور جب تمہارے رب نے موسیٰ کو پکارا کہ" ظالم قوم کے پاس جا — قوم فرعون کے پاس — کیا وہ نہیں ڈرتے"؟ مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے سابقہ تجربات اور چشم دید حالات کی بنا پر عرض کیا" اے میرے رب، مجھے خوف ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلا دیں گے، میرا سینہ گھٹتا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔ آپ ہارون کی طرف رسالت بھیجیں۔ اور مجھ پر اُن کے ہاں ایک جُرم کا الزام بھی ہے۔ اس لیے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل کر دیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا" ہرگز نہیں، تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے۔ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو، ہم رب العالمین کی طرف سے بھیجے گئے ہیں" (الشعراء: ۱۱-۱۶)

حضرت موسیٰ کے عذرات اور ان کا جواب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم کی تعمیل کی۔ اور میدانِ جہاد کی جانب روانہ ہو گئے۔ انہیں اپنے مشن کے تمام خط و خال اور پیش آمدہ مشکلات کا بخوبی اندازہ تھا۔ اسی بنا پر انہوں نے روانگی سے قبل بارگاہِ الٰہی میں تین عذر پیش کیے۔ ایک یہ کہ قومِ فرعون حد درجہ ظالم و سفاک ہے اور مصر پر اُس نے کڑا نظامِ جبر و استبداد مسلط کر رکھا ہے۔ ایسی ظالم قوم کے سامنے دعوتِ حق کو پیش کرنے کا انجام بجز تکذیب و تحقیر کچھ نہ ہو گا۔ دوسرے یہ کہ مجھ پر ایک مصری کے قتل کا الزام ہے۔ اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ یہ قوم مجھ سے

قتل کا انتقام لیے بغیر نہ رہے گی۔ اور تیسرے یہ کہ میرے سینے میں وہ زور اور زبان میں وہ فصاحت نہیں جو دعوت کو مؤثر طور پر پیش کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کے ان تینوں اندیشوں میں سے تیسرے اندیشہ کے جواب میں حضرت ہارونؑ کو آپؑ کے ساتھ رسول بنا کر بھیج دیا۔ حضرت ہارون زبان اور دلیل و حجت کے دھنی تھے۔ مگر پہلے دونوں خدشوں کو ناقابلِ لحاظ ٹھہراتے ہوئے فرمایا: "تم دونوں جاؤ ہماری نشانیاں لے کر، ہم تمہارے ساتھ سب کچھ سنتے رہیں گے" — چنانچہ موسیٰ اور ہارون کے درمیان یہی کامل اتحاد اور جبر کسر کا تعلق تھا جو فرعون وکلیم کی کشمکش میں کامیاب کردار کی صورت میں اُبھرا۔ "انا رسول ربِ العٰلمین" کے الفاظ اسی کامل اتحاد کو خوشنما پیرائے میں ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں دعوتِ حق کے علمبرداروں کو کامیابی کا نہایت اہم گر بتا دیا گیا ہے۔

داعیٔ حق دربارِ فرعون میں | حضرت موسیٰ دربارِ فرعون میں پہنچے، فرعون کو دعوتِ حق پیش کی، اور بنی اسرائیل کی آقائی سے دست بردار ہو جانے کا مطالبہ کیا: "موسیٰ نے کہا، اے فرعون! میں کائنات کے مالک کی طرف سے بھیجا ہوا آیا ہوں، میرا منصب یہی ہے کہ اللہ کا نام لے کر کوئی بات حق کے سوا نہ کہوں، میں تم لوگوں کے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیلِ صریح لے کر آیا ہوں، لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے" (اعراف: ۱۰۴-۱۰۵)

لیکن فرعون نے استکبار کی روش اختیار کی۔ دعوتِ حق کو ٹھکرا دیا اور جادوگروں کو جمع کیا اور اُن کے ساحرانہ کمالات کا سہارا لیتے ہوئے حضرت موسیٰ کی دعوت کو اور آپؑ کے معجزات کو چیلنج کیا مگر حضرت موسیٰ نے بر خود غلط فرمانروا کی ستمرانیوں اور مذموم چالوں کا نہایت پامردی اور جراتِ ایمانی سے مقابلہ کیا، آپؑ اگرچہ جادوگروں کے جادو سے تھوڑی دیر کے لیے دل میں مرعوب ہوئے مگر فوراً سنبھلے اور جرات کے ساتھ فرمایا: "اے جادوگرو! یہ جو کچھ تم نے پھینکا ہے، یہ جادو ہے، اللہ ابھی اسے باطل کیے دیتا ہے۔ مفسدوں کے کام کو اللہ سدھرنے نہیں دیتا اور اللہ اپنے فرمانوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے، خواہ مجرموں

کو وہ کیسا ہی ناگوار ہو" (یونس : ۸۱-۸۲) یہ کہا اور اپنا عصا زمین پر پھینک دیا۔ اس کا پھینکنا تھا کہ آن کی آن میں وہ اُن کے جھوٹے طلسم کو نگلتا چلا گیا۔ اس طرح جو حق تھا وہ حق ثابت ہوا اور جو کچھ انہوں نے بنا رکھا تھا وہ باطل ہو کر رہ گیا۔ فرعون اور اس کے ساتھی میدانِ مقابلہ میں مغلوب ہوتے اور اُلٹے ذلیل ہوئے اور جادوگروں کا یہ حال ہوا کہ گویا کسی چیز نے اندر سے انہیں سجدے میں گرا دیا۔ کہنے لگے: "ہم نے مان لیا رب العالمین کو، اُس رب کو جسے موسیٰ اور ہارون مانتے ہیں" (اعراف: ۱۱۷-۱۲۲)۔ فرعون یہ دیکھ کر غیظ و غضب میں ڈوب گیا اور اپنے وقار و آبرو کو بچانے کے خیال سے ذلیل ترین ہتھکنڈوں پر اُتر آیا۔ یہاں تک کہ موسیٰ اور پیروانِ موسیٰ کے قتل کے درپے ہو گیا۔

کامیابی کی حقیقت اور اس کے اصول | الغرض بنی اسرائیل پر فرعونی جبر و تشدد کے مہیب سائے چھا گئے۔ بالآخر قوم بلبلا اٹھی اور اس کے صبر کا پیالہ چھلک گیا۔ مگر اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر نے بے تابی دکھانے کے بجائے مزید صبر و برداشت کی تلقین کی۔ فرمایا: "اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو، زمین اللہ کی ہے۔ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے اور آخری کامیابی انہی کے لیے ہے جو اس سے ڈرتے ہوئے کام کریں"۔ لیکن قوم کے اندر عذاب و استبداد کے بے نہایت تازیانوں کی تاب باقی نہ رہی اور وہ بے ساختہ پکار اٹھی: "(اے موسیٰ) تیرے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جاتے تھے اور اب تیرے آنے پر بھی ستائے جا رہے ہیں" حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی اٹل سنت پر اپنے کامل اعتماد کا اعلان کیا اور قوم کو آگاہ کیا کہ "امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور تم کو زمین میں خلیفہ بناتے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو" (اعراف: ۱۲۸-۱۲۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ جواب نہایت گہرے تدبر و مطالعہ کا متقاضی ہے۔ اس میں وہ ایسی بڑی حقیقتیں بیان کر دی گئی ہیں جو دعوتِ حق کی حقیقت و مزاج کے لیے امتیازی علامت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی حقیقت حضرت موسیٰ کے ان الفاظ سے مترشح ہوتی ہے کہ "امید ہے

تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے"۔ یہ مختصر سا جملہ کئی پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ داعی کو سراسر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور کسی فوری نصرت پر نگاہ جمائے بغیر یکسوئی کے ساتھ راہِ حق پر گامزن رہنا چاہیے۔ ثانیاً یہ کہ دشمن کو ہلاک کرنا اللہ کا کام ہے۔ وہ اسے جلدی سرانجام دے یا بدیر یہ اُس کی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اگر دشمن کی مہلت طویل ہو گئی ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت پنہاں ہو گی اور جو جتنی طویل مہلت پاتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ چوٹ کھاتا ہے۔ ثالثاً یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دین کی خاطر جو معرکہ بھی گرم کیا جائے اُس میں دشمن پر فتح کا حاصل ہونا عین مرضیٔ الٰہی پر موقوف ہے۔ بظاہر شکست خوردہ ہو کر مایوس ہو جانا گویا مرضیٔ الٰہی پر عدمِ اعتماد کا اعلان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وما النصر الا من عند اللہ۔ نیز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس قول سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ باطل خواہ کتنا ہی منہ زور ہو زود یا بدیر کامیابی اور برتری حق ہی کے پاؤں چومتی ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے پاس بھیجا تھا تو اس اصول سے باخبر کر دیا تھا اور فرمایا تھا: "غلبہ تمہارا اور تمہارے پیروؤں کا ہی ہو گا" (القصص: ۳۵) مگر بایں ہمہ حضرت موسیٰ کا اپنی مظلوم و مقہور قوم کو قطعیت کے بجائے رجاء کے انداز میں یہ فرمانا کہ "امید ہے تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے" دراصل تفویضِ مطلق اور توکلِ خالص کا اظہار ہے اور اس سے اصل مقصد قوم کو رجوع الی اللہ کا مسلک اختیار کرنے کی تلقین ہے لیکن یہ تفویضِ مطلق اور توکلِ خالص کا اعلان اس مرحلہ پر آ کر کیا گیا ہے جبکہ حضرت موسیٰ اللہ کے راستہ میں اپنی ہر چیز قربان کر چکے تھے اور سعی و جہد کی آخری رمق بھی پیش کر چکے تھے اور اربابِ اقتدار کے سامنے ہر ممکن ذریعہ سے دعوتِ حق کو واضح کر چکے تھے۔

حضرت موسیٰ کا یہ حقیقت آمیز ارشاد دعوتِ اسلامی کے علمبرداروں کو ایک عام فکری لغزش سے اجتناب کی نصیحت کرتا ہے۔ نصرتِ الٰہی کے معاملے میں جلدی مچانا، دعوت کو بے ثمر دیکھ کر بیزار ہو جانا اور یاس کا شکار ہو جانا اسی فکری لغزش کے مظاہر ہیں۔ دعوت کو فروغ حاصل ہو یا ابتلاء اور آسمانی مدد کی کوئی علامت اُفقِ دعوت پر نمودار ہو یا نہ ہو، دونوں حالتوں میں داعی کو باوقار اور پُر امید رہنا چاہیے۔ کامیابی دیکھ کر اترانا درست نہیں ہے اور شکست ہو تو

اضطراب صحیح نہیں ہے

فتح و شکست نصیبوں پہ ہے وے اے امیر
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

دوسری اہم حقیقت جو حضرت موسیٰ کے جواب سے اُجاگر ہوتی ہے وہ آپ کا یہ ارشاد ہے کہ "اور امید ہے کہ اللہ تم کو زمین میں خلیفہ بناتے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو"۔ آپؑ نے کامیابی اور غلبہ کو خلافتِ الٰہی سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے اوّلاً تو پہلی حقیقت کی مزید تائید ہوتی ہے کہ خلافت عطا کرنا اور ضعیفوں کو قوت دینا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور ثانیاً یہ معلوم ہوا کہ غلبۂ محض کا حصول نصرتِ الٰہی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت نصرتِ الٰہی یہ ہے کہ کامیاب ہونے والا گروہ منصبِ خلافت پائے۔ اس بیان سے یہ عقدہ بھی حل ہوا کہ استخلاف فی الارض نعمت مطلق اور عطیۂ الٰہی نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسے انسانوں کے اعمال پرکھنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ وہ اس منصب پر فروکش ہونے والوں کی تمام کارگزاریوں پر نظر رکھے گا اور پھر ان کارگزاریوں کے بموجب اپنی نصرت کو برقرار رکھنے یا منقطع کر دینے کا فیصلہ کرے گا پس نصرتِ الٰہی ہمیشہ اُس عمل کے بمقدار نازل ہوتی رہے گی جو کامیاب ہونے والا گروہ حصولِ کامیابی کے بعد خداوند جلّ و علا کے حضور پیش کرے گا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ نصرتِ الٰہی کا دارومدار دو چیزوں پر ہے ایک حسنِ نیت اور دوسرے حسنِ عمل۔ چنانچہ ہر وہ غلبہ جو عزمِ صالح اور ارادۂ نیک پر مبنی نہیں ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ اعمال کے ساتھ مربوط نہیں ہے میزانِ خداوندی میں سراسر بے قیمت ہے اور نصرتِ الٰہی کے عنوان سے قطعاً محروم ہے۔ اہلِ ایمان کو ایسے بے بنیاد غلبہ اور جھوٹے وقار کو ذرا بھی اعتنا نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ بسا اوقات ایسے لوگوں کو بھی بظاہر غلبہ حاصل ہو جاتا ہے جو درحقیقت اللہ کے نزدیک ملعون اور معتوب ہوتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کو مہلت کے طور پر غلبہ نصیب ہو جاتا ہے تاکہ وہ ظلم و استبداد کی جس انتہا تک پہنچنا چاہیں

پہنچ جائیں اور پھر غضبِ الٰہی کے زیادہ سے زیادہ مستحق ثابت ہو جائیں۔ یہ شکل ایسے لوگوں کو ایک بڑی شکست اور ایک رسوا ترین عاقبت سے دوچار کرنے کے لیے استدراج کے طور پر اختیار کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی عظیم حقیقت کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"اور جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور وہ یکایک ہکا بکا رہ گئے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور سب تعریف اللہ رب العٰلمین ہی کے لیے ہے" (اعراف: ۴۴-۴۵)

مصلحت کا انجام فرعون کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہی معاملہ کیا۔ حق اگرچہ حضرت موسیٰ کے ساتھ تھا، اور حضرت موسیٰ کے برحق ہونے کی واضح دلیل خود جادوگروں کے کھلم کھلا ایمان لے آنے میں موجود تھی مگر اس کے باوجود فرعون نے کچھ عرصہ تک مصر میں تشدد و سفاکیت کی فضا پیدا کیے رکھی، برابر ظلم و ستم کا ارتکاب کرتا رہا۔ بنی اسرائیل کا خون پانی کی طرح بہاتا رہا۔ باشندگانِ ملک دم بخود تھے۔ کسی ایک کو بھی حق بات کہنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ مصلحت شناس لوگ بھی اپنے زاویوں سے نکل کر تقربِ شاہی کے پیچھے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ اور اس طرح فرعون کے نظامِ جبر کو مزید مستحکم کرنے کا موجب ہوئے۔ اس مصلحت شناس گروہ میں سے وہ لوگ بھی تھے جو خود حضرت موسیٰ کی قوم میں سے تھے۔ مگر اپنے مصالح کی بنا پر حضرت موسیٰ کو چھوڑ چکے تھے۔ ایسے لوگوں میں سے اللہ تعالیٰ نے ایک شخصیت کا قرآن میں ذکر کیا ہے۔ اور وہ قارون کی شخصیت ہے: "قارون موسیٰ کی قوم کا ایک شخص تھا، پھر وہ اپنی قوم کے خلاف سرکش ہو گیا اور ہم نے اس کو اتنے خزانے دے رکھے تھے کہ ان کی کنجیاں طاقتور آدمیوں کی ایک جماعت مشکل سے اٹھا سکتی تھی، ایک دفعہ اس کی قوم کے لوگوں نے اس سے کہا: "پھول نہ جا، اللہ پھولنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے

آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر، احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا" (القصص : ۷۶ - ۷۷)

سب سے تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہ قارون جسے مال و دولت کی فراوانی اور جاہ و منزلت کی محبت نے جادۂ مستقیم سے منحرف کر دیا تھا، حضرت موسیٰ کا رشتہ دار تھا۔ بلکہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ کا چچازاد بھائی تھا۔ اس کا نام "منور" تھا۔ تورات کو بڑی خوش الحانی کے ساتھ پڑھتا تھا (ابن کثیر) لیکن جب وہ جادۂ حق سے منحرف ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اُسے نہ مال و دولت بچا سکا، نہ نبی کی قرابت داری کام آئی اور نہ تورات کا خوش الحانی سے پڑھنا سود مند ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی شدید ترین لعنت نے اُسے آ دبوچا "ہم نے اُسے اور اُس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا، پھر کوئی اُس کے حامیوں کا گروہ نہ تھا جو اللہ کے مقابلہ میں اُس کی مدد کو آتا اور نہ وہ خود اپنی مدد آپ کر سکا" (القصص : ۸۱)

ضعفاء کے حیلے لوگوں پر فرعون کا تشدد اپنی انتہا کو پہنچ گیا، ہر طرف خوف و ہراس کے بادل چھا گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں کو روپوش ہو جانے اور پناہ گاہوں کا رُخ کرنے کا مشورہ دیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اشارہ کیا کہ مصر میں اپنی قوم کے لیے گھروں میں پناہ گزین ہو جاؤ اور اپنے مکانوں کو قبلہ قرار دے لو اور نماز قائم کرو اور اہلِ ایمان کو بشارت دے دو" (یونس : ۸۷)

حضرت موسیٰ کی دُعا بنی اسرائیل کے مصائب و آلام روز بروز بڑھتے گئے۔ بالآخر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا: "اے ہمارے پروردگار! تو نے فرعون اور اس کے سرداروں کو دنیا کی زندگی میں زینت اور اموال سے نواز رکھا ہے۔ اے رب کیا یہ اس لیے ہے کہ وہ لوگوں کو تیری راہ سے بھٹکائیں؟ اے رب! ان کے مال غارت کر دے اور ان کے دلوں پر ایسی مہر کر دے کہ ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: تم دونوں کی دعا قبول کی گئی۔ ثابت قدم رہو اور ان لوگوں کے طریقے کی ہرگز پیروی نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔" (یونس: ۸۸-۸۹)

لیکن اس دعائے مستجاب کے آثار ایک مدت کے بعد ہویدا ہوتے۔ جسے بعض مفسرین نے چالیس روز بتایا ہے اور بعض نے چالیس سال۔ بہر حال جب قرآن نے خود اس مدت کا تعین نہیں کیا، ہمیں اس کے تعین کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمارے لیے یہاں صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ حالات کی کشادگی اور مصائب کے چھٹنے میں تاخیر کا واقع ہو جانا دعا کی عدمِ قبولیت کی علامت نہیں ہے۔ قبولیتِ دعا کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے حالات و معاملات اُسی طرح تبدیل کر دے جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ دعا مانگنے والا انسان خواہ اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین مخلوق میں سے ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی سنت و مصلحت کے مطابق ہی حالات کو گردش دیتی ہے۔ وہ ذات اپنے بندوں پر رحیم و شفیق ہے۔ اور اُن کے حقیقی مصالح سے بخوبی واقف ہے۔

نظامِ آمریت کی نفسیاتی کیفیات

قبولیتِ دعا کا آغاز اس طرح سے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم کو مصر سے ہجرت کر جانے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ یہ لوگ مصر سے نکل پڑے۔ فرعون غضبناک ہو گیا۔ اُسے یہ ناگوار گزرا کہ حضرت موسیٰ اور ان کے پیرو فرعونی نظام کے آگے سرِ اطاعت خم کر دینے کے بجائے ملک سے خروج کر رہے ہیں۔ اُس کا یہ غصہ دو باتوں سے مرکب تھا۔ ایک یہ کہ بنی اسرائیل کی ہجرت سے باقیماندہ باشندگانِ ملک کے اندر بھی استبداد کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبھر آئے گا۔ اور فرعونی اقتدار کی چولیں ڈھیلی پڑ جائیں گی اور ثانیاً یہ کہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل ساز و سامان سے لیس ہو کر باہر سے سلطنتِ فرعون پر حملہ کر دیں۔ بہر حال ڈکٹیٹر ہمیشہ طرح طرح کے اندیشوں کے اندر گھرا رہتا ہے۔ اور اپنے ظلم و ستم کی بنا پر اُسے ہر وقت یہ خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کوئی ہاتھ اُسے ناگہانی طور پر کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دے۔ فرعون کی بوکھلاہٹ بھی اسی نفسیاتی کیفیت کا مظہر تھی۔

فرعون کا عبرتناک انجام | بنی اسرائیل کی ہجرت کی خبر سن کر فرعون نے فوراً اپنی فوجوں کو اکٹھا کیا اور اسلحہ سے لدا ہوا لشکر لے کر بنی اسرائیل کے تعاقب میں نکل پڑا۔ اس لشکر کے پیش رووں میں خود فرعون اور اس کے درباری اور حاشیہ نشین تھے۔ طلوعِ صبح کے وقت یہ ساحل سمندر کے قریب حضرت موسیٰ کے ساتھیوں تک پہنچ گئے۔ حضرت موسیٰ کے ساتھیوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک لشکرِ عظیم چمکتی ہوئی تلواروں کے ساتھ نظر آیا اور جب اپنے آگے نگاہ دوڑائی تو تلاطم خیز سمندر نظر آیا۔ انہیں اپنی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ اضطراب شدید میں مبتلا ہو گئے۔ مگر حضرت موسیٰ یقین و اذعان کے پُرکیف لمحوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور انہیں ذاتِ الٰہی کے ماسوا کسی چیز کا احساس تک نہیں تھا۔ اس نازک گھڑی کی منظر کشی کرتے ہوئے قرآن نے بتایا ہے کہ "صبح ہوتے ہی یہ لوگ (یعنی فرعون اور اس کی افواجِ قاہرہ) ان کے تعاقب میں چل پڑے۔ جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا تو موسیٰ کے ساتھی چیخ اٹھے کہ "ہم تو پکڑے گئے"۔ موسیٰ نے کہا "ہرگز نہیں۔ میرے ساتھ میرا رب ہے۔ وہ ضرور میری رہنمائی کرے گا"۔ ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ "مارا اپنا عصا سمندر پر" یکایک سمندر پھٹ گیا اور اس کا ہر ٹکڑا ایک عظیم الشان پہاڑ کی طرح ہو گیا"۔ (الشعراء: ۶۰-۶۱) جب انسانی وسائل جواب دے گئے اور بشری تدبیریں ناکامی کی نذر ہو گئیں تو ایک معجزہ نمودار ہوا اور عین عالمِ یاس میں رحمتِ خداوندی نے دست گیری کی۔ حضرت موسیٰ اور اُن کے ساتھی سمندر میں داخل ہو گئے۔ لشکرِ فرعون نے ساحلِ سمندر تک آکر واپس چلا جانا اپنی شانِ بلند کے منافی سمجھا اور وہ بھی سمندر میں داخل ہو گیا۔ ایک صریح معجزہ دیکھ کر بھی ان لوگوں کی آنکھیں نہ کھلیں اور بالآخر ہٹ دھرمی، کوتاہی اور جھوٹے غرور نے اُن کو پنجۂ ہلاکت کے حوالے کر دیا۔ "اسی جگہ (سمندر کے بیچ) ہم دوسرے گروہ کو بھی قریب لے آئے۔ موسیٰ اور ان سب لوگوں کو جو اُن کے ساتھ تھے، ہم نے بچا لیا اور دوسروں کو غرق کر دیا۔ اس واقعہ میں ایک نشانی ہے، مگر ان لوگوں میں سے اکثر ماننے والے نہیں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تیرا رب زبردست بھی ہے اور رحیم بھی ہے"۔ (الشعراء: ۶۴-۶۸)

درسِ عبرت ہلاکتِ فرعون کا آخری منظر اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر قصۂ فرعون میں ذکر کیا ہے۔ جس سے مقصود یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے سرکش اور جابر حکمرانوں کو اپنا انجام معلوم ہوتا رہے۔ اور دوسرا درس یہ دیا کہ ظالم و جابر فرمانرواؤں کا دماغ اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا اور وہ اس وقت تک راہِ حق اختیار نہیں کر سکتے جب تک کوئی بلائے عظیم اُن کا گلا نہیں دبوچ لیتی اور حالات اُن کے اختیار سے باہر نہیں ہو جاتے ...... " اور ہم بنی اسرائیل کو سمندر سے گزار لے گئے پھر فرعون اور اس کے لشکر ظلم اور زیادتی کی غرض سے ان کے پیچھے چلے —حتیٰ کہ جب فرعون ڈوبنے لگا تو بول اٹھا "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اُس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سرِ اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں" (جواب دیا گیا) " اب ایمان لاتا ہے! حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا۔ اب تو ہم صرف تیری لاش ہی کو بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت رہے۔ اگرچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو ہماری نشانیوں سے غفلت برتتے ہیں" (یونس: ۹۰-۹۲)

بنی اسرائیل کا یومِ آزادی بخاری میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے یہود کو محرم کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے دیکھا۔ آپ نے یہود سے دریافت فرمایا: " یہ کیسا دن ہے جس میں تم روزہ رکھتے ہو؟" یہود نے کہا: " اس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون پر غلبہ حاصل ہوا تھا" چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا: " تم حضرت موسیٰ کے ساتھ یہود سے زیادہ تعلق رکھنے کے حقدار ہو۔ لہٰذا تم بھی اس دن روزہ رکھا کرو۔"

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اور آپ کے پیروکار اس امر کے زیادہ حقدار ہیں کہ وہ اس دن کو ایک یادگار کے طور پر خوش آمدید کہیں جس دن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون لعین پر فتح سے سرفراز فرمایا تھا۔ پس ہر دور میں اسلامی دعوت کے

علمبرداروں کو، خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، فرعون و کلیم کی داستانِ کشمکش کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیے اور جب کبھی انہیں کسی ظالم کے ظلم اور کسی آمر کی آمریت کے تند و تیز حملے اپنی لپیٹ میں لیں انہیں بنی اسرائیل کی اُس کٹھن آزمائش کو یاد کر لینا چاہیے، جس کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے: "فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے ایک گروہ کو وہ ذلیل کرتا تھا، اس کے لڑکوں کو قتل کرتا اور اُس کی لڑکیوں کو جیتا رہنے دیتا تھا، وہ مفسد لوگوں میں سے تھا" (القصص: ۵)

لیکن اس کے ساتھ انہیں اللہ تعالیٰ کا یہ امید افزا اور یقین افروز پیغام بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بالآخر ضعفاء کو اپنی نصرت سے سرفراز کرتا ہے اور نظام جبر کو ایک مدت معین تک ڈھیل دینے کے بعد ضعفاء کے ہاتھوں کیفرِ کردار تک پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے حق میں یہی فرمایا تھا: "ہم نے ارادہ کر لیا کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور انہی کو وارث بنائیں، اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان سے فرعون و ہامان کے لشکروں کو وہی کچھ دکھلا دیں جس کا انہیں ڈر تھا" (القصص ۶)

یہ "مہربانی" غیر مشروط طور پر حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کی اولین شرط خود اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کی ہے کہ "وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ" (غلبہ تمہیں ہی حاصل ہوگا بشرطیکہ تم مومن کامل بن کر رہے)۔

یوم عاشوراء کے روزے کے سلسلے میں مزید گزارش یہ ہے کہ جو لوگ یہ روزہ رکھنا چاہیں وہ دسویں تاریخ کے ساتھ نویں تاریخ کا بھی اضافہ کریں۔ اور ایک کے بجائے دو روزے رکھیں۔ مسلم میں مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میں اگر آئندہ سال زندہ رہا تو نویں تاریخ کا بھی روزہ رکھوں گا آپؐ کا منشا یہ تھا کہ اس طرح یہود و نصاریٰ کی مکمل مشابہت سے احتراز کی صورت پیدا کر لی جائے۔

[یہ مضمون "المسلمون" شام سے ماخوذ ہے ہم نے حسب ضرورت اس میں کہیں کہیں ترمیم و اضافہ سے کام لیا ہے ۔ خ۔ح]

مطلق العنان اقتدار کے تحت محدود مذہبی مناصب

اوّلین تجربہ ——— عبّاسی دور میں

(۲)

نعیم صدّیقی

[ایک محدود مضمون کا خاکہ لے کے چلا تھا مگر جب اس کی تیاری کے لیے مطالعہ شروع کیا تو تاریخ کی دلچسپ وادیوں کی سیر کرتے ہوئے ایک ایک ذرہ کی لوحِ جبیں پر ماضی کے رنگا رنگ نقوش سامنے آئے اور بے اختیار جی چاہا کہ اپنی تلی حکایتِ خونچکاں کے بکھرے ہوئے ـــ زیادہ سے زیادہ ـــ اوراق لالہ و نرگس و گل سے چھین لاؤں اور پھر ایک ایک سطر میں قرنوں لمبے ابواب کو سمیٹ دوں، سو وہی ہوا کہ :

" افسانہ کہ گفت نظیری کتاب شد

اب پیشتر اس کے کہ راہوارِ قلم عنوان کے مطابق اصل مرحلۂ شوق میں داخل ہو، کچھ مشکل گھاٹیوں کے جادۂ پُرپیچ کو قطع کرنا لازم ہوگیا ہے۔ جیسے کہ عشق کے ایک مارے نے کہا تھا کہ ؎

کیف الوصول الیٰ سعاد ودونہا

قلل الجبال و بینہا حتوف

اس مقالہ سے مختلف حلقوں میں خاصی دلچسپی لی گئی ہے۔ بہت سے تاثرات مجھ تک پہنچے ہیں۔ اسی سلسلے میں بعض محبت کیش مبصرین کی یہ رائے بھی سامنے آئی ہے کہ مستشرقین کے ہاں سے استناد صحیح نہیں۔ کیونکہ ان حضرات کے ہاں اوّل تو کھلا یا چھپا ہوا تعصب کارفرما ہوتا ہے اور مستزاد یہ کہ معلومات غلط طور پر اخذ کردہ ہوتی ہیں۔ میں

خود اسی کا قائل ہوں۔ کوئی بات مجرد ان کے اقوال پر مبنی نہیں کرتا بلکہ تقریباً ہر بات کے لیے میرے سامنے سب سے پہلے اساسی مآخذ کے حوالے ہیں، مرتبۂ ثانی پر اردو یا عربی میں زمانۂ حال کے جن علماء نے متعلقہ بحثوں پر کچھ لکھا ہے ان کی تحریریں پیش نظر ہیں اور مرتبۂ ثالث پر پہلے سے ثابت شدہ امور کی تائید میں بعض حوالے یا اقتباسات مستشرقین کے ہاں سے صرف اس لیے لے رہا ہوں کہ انگریزی پرست اور مستشرق پسند عنصر کی تسلی ہو سکے۔ فی الوقت تو میں اس مقالے کو عجلت میں لکھ رہا ہوں اور ضروری باتوں کے لیے کوئی ایک آدھ حوالہ درج کر رہا ہوں۔ کیونکہ اس کی اقساط ایک ماہنامہ میں آ رہی ہیں۔ البتہ بعد میں اسے کتابی صورت میں شائع کرنے سے پہلے ایک ایک دعویٰ کے لیے تین تین چار چار حوالے اکٹھے درج کر دوں گا۔ اور ان شاء اللہ کوئی ایک حوالہ بھی اس وقت ایسا آپ کو نہ ملے گا جس کی اساس ہمارے اپنے مستند مآخذ پر نہ ہو اور جس کی تصدیق اصل کتب کی طرف رجوع کر کے نہ کر لی گئی ہو۔ وما توفیقی الا باللہ العظیم!]

آگے چلنے سے پہلے اس تاریخی پس منظر کو نگاہ میں تازہ کر لیجیے جسے ہم بیان کر چکے ہیں کم از کم خلاصہ کے طور پر یہ حقیقت سامنے رکھیے کہ مطلق العنان اقتدار آیا تو زندگی کا وہ شیرازۂ وحدت ٹوٹ گیا جسے اسلام نے پہلی بار معیاری شان سے قائم کیا تھا۔ دور بادشاہت میں دو چیزوں کو اسلام کی بالادستی سے نکال لیا گیا۔ ایک سیاسی پالیسیاں اور انتظامی اقدامات، دوسرے مالیات۔ سیاسی اقتدار اور مالیات جب کسی نظریہ کے ہاتھ سے نکل جائیں تو پھر نظام اس کا نظام نہیں رہتا مگر ایک چیز اسی اسلام کے قبضے میں رہی جس کی حیثیت عام سماجی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی سی تھی۔ یہ تھا شعبۂ عدلیہ یا نظامِ قضا۔

اسلامی نظامِ قضاء کی اہمیت یہی نظام تھا جس میں اسلام کو آہستہ آہستہ سمٹ جانا پڑا۔ پھر اسی شعبۂ عدلیہ کے مناصب ہی کو محدود مذہبی مناصب کی حیثیت حاصل ہوئی اور انہی مناصب کو ـــ اور ان پر فائز ہونے والے قاضیوں اور مفتیوں کو مطلق العنان اقتدار نے اپنا

آلۂ کار بنانے کی کوششیں کیں۔ ان کوششوں کے خلاف اربابِ عزیمت کا ایک مضبوط محاذ برسرِ کشمکش رہا اور قرونِ مابعد میں بھی ان کی قائم کردہ روایات نے ہمیشہ جیدار شخصیتوں میں تابِ مقاومت پیدا کی۔ لیکن دوسری طرف یہ امر واقعہ ہمارے لیے ایک سرمایۂ ندامت بھی ہے کہ کمزور اور جاہ طلب افراد نے اپنے علمِ دین کو دنیا طلبی کے قمار خانہ میں جا کر داؤں پر رکھ دیا اور مستبد حکمرانوں کے آلہ ہائے کار بن گئے۔ اوائل میں ایسے لوگ کم تھے۔ قرونِ مابعد میں ان کی صفیں زیادہ وسیع ہو گئیں۔ پھر یہی منصبِ قضا ہے جو نیچے جا کر "شیخ الاسلام" اور "مفتیٔ دین" اور "وزارتِ امورِ شرعیہ" اور "محکمۂ اوقاف" جیسے ادارات کی شکل اختیار کر تا گیا۔ پس ہماری کہانی کا محور یہی ہے ؎

ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

نظریۂ اسلامی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس محدودیت کے باوجود جو اسلام جیسے نظامِ جامع پر مسلط کر دی گئی تھی، عدلیہ پر اسلام کا قبضہ رہنے کے معنی یہ تھے کہ لوگوں کے روزمرہ معاملات کے فیصلے اسلامی قانون کے تحت ہوں۔ کوئی بھی قانون جو معاشرہ پر اس کی عدالتوں کے ذریعے عملاً نافذ ہو رہا ہو وہ عوام الناس کی زندگیوں پر بڑا بھاری اثر رکھتا ہے حقیقت یہ ہے کہ دورِ بادشاہت میں اسلامی قانون ہی ایک ایسا عنصر تھا جس نے اجتماعی دائرے میں اثر انداز ہو کر ملت کو ملتِ اسلامیہ بنائے رکھا اور دین سے اس کا تعلق سیاسی فکری اور ثقافتی فتنوں کے طوفان میں کٹنے نہیں دیا۔ ابن المقفع جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، قانون کی اس اہمیت کو بادشاہ کے سامنے ان الفاظ میں بیان کرتا ہے: "واعمقها اثراً فی حیاة المسلمین"۔ یعنی مسلمانوں کی زندگی پر سب سے گہرا اثر ڈالنے والا عنصر یہی اسلامی قانون ہے۔[1] اسلامی قانون ہی کا ایک فیضان یہ تھا کہ اس نے افراد کی زندگیوں کو نجی دائرے سے لے کر کاروباری معاملات تک مربوط کر رکھا تھا۔ بجز ایک کمی کے کہ افراد کو سیاست کے دائرے

[1] ضحی الاسلام — از ڈاکٹر احمد امین مصری۔ ج ۱ ص ۲۱۸ (بہ حوالہ "رسالۃ الصحابہ" از ابن المقفع)

میں قدم رکھنے کا اذن نہ تھا اور ملکی سیاسیات قصرِ شاہی میں دوسرے ہی رُخ پر پروان چڑھ رہی تھیں۔ پھر اسلامی قانون نے تقریباً معمورۂ ارضی کی نصف آبادی کو متعدد اسبابِ افتراق کے ہوتے ہوئے شیرازۂ وحدت میں پرو رکھا تھا۔ مزید یہ کہ اسلامی قانون ہی کے طفیل حال کا زمانہ ماضی سے جڑا ہوا تھا اور نت نئی سیاسی گردشوں سے دوچار ہو کر بھی مسلمان وجودِ ملت کے زمانی تسلسل کو غیر منقطع محسوس کرتے تھے۔ زمانۂ حال کے ایک جواں سال مستشرق نے بھی اس حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

> "اس مربوط کن قوت کا محور قانونِ شریعت تھا۔ یہ قوت اپنی پُر زور اور منضبط گردش کے تحت عبادات سے لے کر حقوقِ ملکیت تک ہر چیز کو نظم و ترتیب دیتی تھی۔ قانون نے اسلامی معاشرہ کو کارڈووا سے ملتان تک سِلکِ اتحاد میں پرو دیا تھا۔ یہ قوت فرد کی زندگی میں بھی وحدت پیدا کرتی تھی اور اپنے الہامی سانچہ کے ذریعے اس کے اعمالِ حیات کو ایک بامقصد کُل میں تبدیل کرتی تھی۔ پھر یہ زمانہ زمانۂ تاریخ میں بھی وحدت پیدا کرتے ہوئے معاشرہ کو تسلسل دیتی تھی۔ جبکہ ضابطۂ الہامی کے مطابق زمین پر ایک نظامِ اجتماعی قائم کرنے کی کوشش اسلام کی ایک مستقل مہم تھی اور اس کے دوران میں اُبھرتی اور مٹتی ہوئی بادشاہتیں اصل داستان میں ضمناً بیان ہونے والے قصوں کی حیثیت رکھتی تھیں[1]"۔

عدلیہ میں اسلامی قانون کی کارفرمائی ایک اور پہلو سے بہت بابرکت ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ سے دینی علوم کی تدوین، تدریس اور ترویج کا کام بڑے وسیع پیمانے پر ہوا اور ہر دور کی منتخب ہستیوں نے اس پہلو سے زریں کارنامے سرانجام دیئے۔ اسلامی قانون کی تدوین کے لیے قرآن کی تفسیر اور احادیث کی ترتیب و تحقیق پر علماء نے بڑی محنتیں کھپائیں۔ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق قانونی نظام کو استوار کرنے کے لیے اساسی نظریات و تصورات کو منقح کیا گیا۔ اسلامی

[1] ISLAM IN THE MODERN HISTORY (MENTOR) - BY: W.C SMITH P: 37

نظامِ قضا ہی اس امر میں ممد ہوا کہ نظامِ تعلیم کا مرکز و محور خود اسلام رہے ورنہ اگر عدلیہ کو بھی خدانخواستہ اسلام کے اثر سے نکال لیا جاتا تو پھر اسلامیت صرف مواعظ میں رہ جاتی اور عملی زندگی سے اس کا کچھ بھی تعلق نہ رہتا۔

اسلامی نظامِ قضا کا وجود اپنے اندر بہت بڑی سیاسی اہمیت بھی رکھتا تھا۔ عدلیہ کے مناصب ہی بادشاہی دور میں اسلامیت کے مظہر تھے۔ اور قاضیوں اور مفتیوں کی دینی شخصیتوں کو دیکھ دیکھ کر عوام الناس یہ تصور زندہ رکھے ہوئے تھے کہ ان کا معاشرہ اسلامی بھی ہے۔ خلیفہ کہلانے والے بادشاہ کی سرپرستیٔ دین کا سب سے بڑا ثبوت یہی ادارۂ قضا تھا۔ قضا کے مناصب پر با اثر اہلِ علم کو لینے کے معنی یہ تھے کہ حکومت معاشرہ کی نگاہوں میں دین پسند اور حامیٔ شریعت قرار پائے۔ چنانچہ یزید ہی کے دور میں یہ پالیسی طے پا گئی تھی کہ حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے با اثر مذہبی شخصیتوں کو اس میں شریک کیا جاتے[1]

علمائے قانون، قاضیوں اور مفتیوں کو عوام الناس کی نگاہوں میں بڑا عزو وقار حاصل تھا اور ان میں سے اربابِ اخلاص مرجعِ خلائق بن کے رہے۔ ائمۂ اکابر کی مقبولیتِ عام کا حال تو کسے معلوم نہیں، صفِ دوم کے ایک فاضلِ قانون عبداللہ بن مبارک کے گرد رقہ میں عقیدت مندوں کا جم ہجوم ہوا اسے دیکھ کر ہارون کی ایک کنیز یہ کہہ اٹھی کہ سلطنت اس کو کہتے ہیں[2] بالفاظِ دیگر کہنا یہ چاہیے کہ علماء اور خصوصاً علمائے قانون کو جمہور میں فکری و ذہنی قیادت کا مقام حاصل تھا۔ اسی لیے حکومت مجبور تھی کہ اس صفِ قیادت کو ساتھ لے۔ چنانچہ علمائے قانون، قضاۃ اور مفتیوں کی صفیں درباری سیاست میں آہستہ آہستہ دخیل ہوتی گئیں — یہ الگ بات ہے کہ جہاں اربابِ اخلاص بادشاہت کے غلط اقدامات میں مزاحم بنتے رہے اور مناصب پر پہنچ کر انہوں نے اقامتِ دین کا معرکہ جاری رکھا، وہاں

---

[1] عقود الجمان۔ باب ۲۱۔

[2] تاریخ ابن خلکان۔ ترجمہ عبداللہ بن مبارک۔ سیرت ائمہ اربعہ از مولانا رئیس احمد جعفری ص ۲۲۴

دنیا طلبوں نے اقتدار کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ نظام الملک طوسی نے جو سلجوق اعظم کا وزیر تھا، اپنی مشہور تصنیف سیاست نامہ (مدونہ ۱۰۹۲ء) میں معاشرہ کے چھ اہم طبقات وعناصر کی جو ترتیب بیان کی ہے ان میں اگرچہ قاضیوں، میلّغوں اور محتسبین کو درجۂ آخر میں رکھا ہے مگر اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طبقہ بھی فعال اور بااثر طبقہ تھا[1]۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت کے سماجی نقشہ میں اصحابِ علم یعنی علماء اور قاضی مرتبۂ بلند پر فائز تھے۔ البتہ ان کا مقام شاہ اور اس کے انتظامی افسروں کے بعد آتا تھا[2]۔ اب ذرا واقعاتی نقشے میں اس سیاسی اثر کا اندازہ کیجیے جس سے قضاۃ بہرہ مند تھے۔ مامون نے موت سے پہلے وصیت کرنا چاہی تو تین عناصر کو جمع کیا گیا: ایک افسرانِ فوج، دوسرے علماء وقضاۃ اور تیسرے خاندانِ شاہی کے افراد[3]۔ اس طرح مقتدر کے فرار کے بعد جب جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا تو اسے حل کرنے کے لیے جو مجلس بیٹھی اس میں سپہ سالار، قضاۃ اور اعیانِ خلافت شریک ہوتے اور اسی مجلس کے فیصلے سے عبد اللہ بن معتز کے ہاتھ پر بیعت کی گئی[4]۔ خلیفہ راشد (۵۲۹ھ تا ۵۳۰ھ) کے خلاف جب سلطان مسعود نے فوجی اقدام کیا اور راشد موصل بھاگ گیا تو مسعود نے بغداد کے قاضیوں اور دوسرے سرکردہ افراد کو جمع کر کے ان سے راشد کی معزولی کی تحریر لکھوائی[5]۔ جب واثق فوت ہوا تو جانشینی کا مسئلہ طے کرنے کے لیے محل میں ایتاخ، وصیف، عمر بن فرج، ابن الزیات اور احمد بن خالد ابو الوزیر جمع ہوئے جن میں قاضی القضاۃ احمد بن ابی دؤاد بھی شامل تھے۔ پہلے بیعت کے لیے محمد بن واثق کو لایا گیا، مگر کم عمری کی وجہ سے مجلس نے اسے خلافت کے لیے قبول نہیں کیا

1. THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM – BY P: 69
2. " " " " " " " P: 269
3. تاریخ طبری، ج ۷، ص ۲۰۸ (واقعات ۲۱۸ھ)۔ المامون۔ از علامہ شبلی نعمانی ص ۱۲۱
4. مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ)۔ از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۷۷
5. الفخری۔ ص ۲۷۱ تا ۲۷۴۔ مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ)۔ از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص

بحث کے بعد جعفر المتوکل کو لا کر مسند نشین کیا گیا اور قاضی احمد بن ابی دؤاد نے اسے بہ دستِ خود قبائے شاہی سے آراستہ کیا، اس کی دستار بندی کی، اس کی پیشانی پر بوسہ دے کر کہا: السلام علیک یا امیر المومنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ گویا یہ اولین بیعت تھی[1]۔ اس طرح کے واقعات کی بنا پر ایک مستشرق یہاں تک کہتا ہے کہ جب کبھی خلیفہ موجود نہ رہتا تو حاکمیت قاضیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی اور بحرانی زمانوں میں معاشرے کے لیے یہی لوگ راہِ عمل طے کرتے تھے[2]۔ بہرحال کسی بھی حکومت وخلافت کو جمہور سے بالا بالا سندِ جواز دینے والے حلقہ علماء وقضاۃ کو ساتھ لیے بغیر کام نہ کر سکتا تھا۔ واقعہ بڑا دلچسپ ہے کہ جب ہلاکو نے بغداد کو فتح کیا تو اس نے غیر مسلم ہونے کے باوجود مدرسہ مستنصریہ کے مفتیوں سے اپنی حکومت کے متعلق مشورہ طلب کیا ___ اور حیف کہ انہوں نے مسلمانوں پر اس کے استحقاقِ حکومت کو تسلیم کر لیا[3]۔

علمائے قانون اور مفتیوں اور قاضیوں کے سیاسی اثر کو ایک اور پہلو سے لیجیے۔ بادشاہت سیاسی ضرورت سے جو قانون سازی (بہ تعبیر قانون یا اخذِ قانون) کرتی تھی، مطلق العنانی کے باوجود اس کے لیے مفتیوں اور قاضیوں کی تائید وحمایت ضروری تھی۔ فرماں روا بسا اوقات قضاۃ کے مشوروں کو مفادِ عامہ یا سیاسی مصالح کے عذر سے مسترد بھی کر دیتے تھے مگر وہ بہرحال ان کے منت کش تھے۔ "قوی ترین حکمراں بھی مجبور تھے کہ ان کے واسطے سے کام کریں[4]"۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ معاشرہ میں جہاں پیروِ اسلام ہونے اور اسلامی قانون کے تابع ہونے کا احساس موجود تھا وہاں "عباسی فرمانروا اپنے تمام اعمال وافعال کو مذہبی رنگ میں پیش کرنا چاہتے تھے[5]" تاکہ

---

[1] تاریخ طبری ج ۷، ذکر خلافت جعفر المتوکل۔ ص ۱۴۱۔

[2] THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM. P:269

[3] الفخری۔ ص ۱۹ - THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM. P:296

[4] P:296 " " " " " "

[5] مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ)، از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۲۱۵۔

ان کے نام نہاد منصبِ خلافت کی دھاک بیٹھی رہے۔ مثلاً مامون نے بعض عناصر کے زیرِ اثر متعہ کو حلال کرنے کا غیر اسلامی قانون نافذ کر دیا مگر وہ محض اس وجہ سے جاری نہ رہ سکا کہ قاضی القضاۃ یحییٰ بن اکثم نے اسے مامون کے سامنے خلافِ شریعت ثابت کیا۔ مامون نے جاری کردہ قانون دوسرے ہی روز واپس لے لیا[1]۔

اسی طرح عباسی دور کی تحریکِ اباحت کے زیرِ اثر حرمات کے استحلال کا جو ذہنی فتنہ اٹھا تھا اور جسے عشرت پسند اور "ثقافت زدہ" حکمرانوں کی سرپرستی حاصل رہتی تھی، اس نے نوبت یہاں تک پہنچا دی کہ ایک کتاب متعہ، نبیذ، شراب، موسیقی، قمار وغیرہ کے جواز پر لکھی گئی (جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں)۔ اس کتاب کا مقصد یہ تھا کہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت ترقی پسندانہ قانون سازی کرنے کے لیے اور اسلام کو بالائی طبقوں کے ذہنی میلانات و خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے مطلق العنان اقتدار کے سامنے "اجتہادی" راہیں کھولی جائیں۔ دوسرے لفظوں میں اسلام میں تحریف کرنے کے لیے اسلام ہی سے دلائل حاصل کیے جائیں۔ یہ کتاب محض ایک ادبی شگوفہ نہ تھی بلکہ اس کا مقصد قانون سازی کے دائرے میں محافظینِ دینِ حق کے بالمقابل انحراف پسند بادشاہت کے ہاتھوں کو فکری تائید بہم پہنچا کر مضبوط کرنا تھا۔ یہ کتاب اگر واقعی اپنی جگہ پاتی۔ تو حالات کا رخ ہی دوسرا ہو جاتا۔ مگر یہ جب معتضد باللہ کے سامنے لائی گئی تو وقت کے قاضی القضاۃ نے اپنے دلائل سے اس کی دھجیاں بکھیر دیں اور اسے نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہ تھا اسلامی عدلیہ کا اثر!

اربابِ عدلیہ، قضاۃ اور علماء کے سیاسی اثر کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ اقتدار کو جب بھی کوئی اہم قدم اٹھانا ہوتا تو اسے اسی عنصر سے سندِ جواز حاصل کرنا پڑتی تھی۔ فرماں روا بہرحال معاشرے کو یہ یقین دلانا چاہتا تھا ــ اور شاید کسی قدر اپنے ضمیر کو بھی ــ کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اسلام کے مطابق ہے۔ اب جہاں معاملہ مضبوط شخصیتوں سے پڑتا وہاں اقتدار کو جھکنا پڑتا لیکن منصب کے محدود ہونے کا لازمی تقاضا یہ تھا کہ جہاں ذرا کمزور آدمی ہاتھ آجاتا وہاں حکمران اسے دھڑلے

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۱۰ ص ۱۹۹۔ ۲۰۰۔ تاریخ ابن خلکان۔ حالات: یحییٰ بن اکثم۔ تاریخ الاسلام حصہ ۴ ج ۲ ص ۷۔ المامون از علامہ شبلی نعمانی۔ ص ۲۰۸، ۲۰۹۔

سے آلۂ کار بنا لیے جاتا۔ اس کشمکش کا حال ہم ذرا آگے بیان کر رہے ہیں۔ بہر حال چند واقعاتی مثالیں لیجیے۔

ہارون الرشید نے ایک بار یہ سوال اٹھایا کہ بنی تغلب سے حضرت عمرؓ نے جو معاہدہ کیا تھا وہ ٹوٹ چکا ہے، کیونکہ یہ لوگ اس کی ایک اہم شرط کو ترک کر چکے ہیں یعنی یہ کہ اپنی اولاد کو عیسائی نہ بنائیں گے۔ لہٰذا اب ان کا خون مباح ہے۔ مگر وہ بنی تغلب کے خلاف عملاً قدم اٹھانے سے پہلے مجبور تھا کہ معاملہ دینی سربراہ کاروں کے سامنے رکھے۔ امام محمدؒ نے ہارون کے نقطۂ نظر کو غلط ثابت کر دیا اور یہ اقدام رک گیا[1]

اسی طرح یحییٰ بن عبداللہ کے معاملے میں جب ہارون نے اپنے امان نامہ کو توڑنا چاہا تو علماء سے قانونِ اسلامی کی طرف رجوع کیا۔ امام محمدؒ جو قاضیٔ رقہ تھے انہوں نے مخالفت کی مگر قاضی وہب نے ہارون کی تائید بڑی خوشامدانہ اور درباری شان سے کی۔ قاضی وہب اور ان کے حامیوں کا فتویٰ چل گیا[2] دراصل اسی اندیشے کی بنا پر یحییٰ بن عبداللہ نے امان نامہ حاصل کرتے ہوئے یہ شرط پوری کروئی تھی کہ اس پر فقہاء، قضاۃ اور بنی ہاشم کے اکابر کی شہادتیں ثبت ہوں۔ مگر اقتدار کی موج ان سارے کناروں کو توڑ کر نکل گئی۔ منصور کے دور میں اہلِ موصل نے بغاوت کی تو قضاۃ سے چاہا گیا کہ وہ ان کو مباح الدم قرار دیں، مگر امام ابوحنیفہ آڑے آئے[3] مامون نے مسئلۂ خلقِ قرآن اٹھایا تو روئے سخن علماء و قضاۃ ہی کی طرف رکھا۔ (تفصیل آگے آئیگی)

سیاسی اقدامات کے لیے (جو اسلام سے اصولاً آزاد کر لیے گئے تھے) اسلامی قانون کی تعبیر اور اس کے انطباق میں جو دخل فقہاء و قضاۃ کو حاصل تھا اس نے ان کی سیاسی اہمیت

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۲ ص ۱۷۳، ۱۷۴ – غلامانِ اسلام۔ از مولانا سعید احمد ایم۔ اے۔ ص ۲۵۷، ۲۵۸ – امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی۔ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ص ۳۷۷ تا ۳۸۰

[2] تاریخ طبری ج ۱۰، ص ۵۷ – مناقب کردری ج ۲، ص ۱۶۴ – مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن۔ ص ۳۱۶ – امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا گیلانی ص ۳۷۴۔ سیرت الائمۃ الاربعۃ ص ۲۳۵

بڑھا دی۔ اس قول میں شاید ہلکا سا مبالغہ ہو کہ "ایک بار اسلام کی تعبیر کا منصب ان کے ہاتھ میں آجانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرہ پر ان کا اثر بسا اوقات خود خلیفہ کے مقابلے میں زور پکڑ جاتا"[1]
بعد کے دورِ انحطاط میں جبکہ پوری سیاسی قوت سلطان کے ہاتھ میں چلی گئی اور مذہبی مناصب کا دائرہ اختیار بالکل محدود ہو گیا، اس وقت بھی زوردار شخصیتیں خاصی اثر انداز ہوتیں۔ مثلاً ترکی کے "شیخ الاسلام" (GRAND MUETI OF TURKY) کے اختیارات اور اس کے فتوے بسا اوقات سلطان کو بے بس کر دیتے تھے۔ اسی طرح صفوی ایران کے قاضیوں کی آواز۔ معاملات کے طے کرنے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی تھی[2]

گویا فقہاء و قضاۃ منصب کی محدودیت کے باوجود تین اطراف سے اثر انداز تھے ایک دائرہ سیاست میں، دوسرے قانون سازی میں، تیسرے سرکاری اقدامات کے لیے قانون کی تعبیر کرنے میں۔

اس کے علاوہ قاضی کے پاس جو عدالتی اختیار تھا وہ خود ایک بڑی طاقت تھا اور کثیر واقعات ہیں کہ مضبوط قاضیوں نے اقتدار کی خواہشات، مداخلتوں اور سفارشوں کو مسترد کر کے فیصلے دیتے اور کتنے ہی ایسے فیصلے تھے جن کی زد فرماں روا یا اس کے اقرباء کے مفاد پر پڑتی تھی۔ مثالیں دوسرے موقع پر آئیں گی۔ خصوصاً عدالتِ عظمیٰ (یا عدالتِ مرافعہ) جسے "نظر المظالم" (THE COURT OF REVIEWER OF WRONGS) یا محکمہ مظالم کہا جاتا تھا (پورا اصطلاحی نام: دیوان النظر فی المظالم) اور جس کا مسند نشین قاضی مظالم کہلاتا تھا[3] قاضیوں اور محتسبوں سے

---

[1] THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM. P:296

[2] " " " " P368

[3] احکام السلطانیہ۔ ماوردی۔ باب ہفتم۔ المحاسن والمساوی بیہقی (مطبوعہ یورپ) ص ۵۷۷۔ مروج الذہب مسعودی ج ۴ ص ۱۲۔ طبری ج ۳ ص ۱۷۳۶ ۔ مسلمانوں کا نظم مملکت از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۲۲۴-۲۲۵۔
THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM. P:347-8 –
A SHORT HISTORY OF SARACENS — BY AMEER ALI SAYYAD P:422.
HISTORY OF THE ARABS — BY PR. HITTI. P:527.

اوپر بہت بڑا اختیار رکھتی تھی، یہاں تک کہ "رٹ" (WRIT) کی نوعیت کے استغاثے اس کے سامنے جاتے تھے۔ ان اپیلوں کے ساتھ ساتھ جو ماتحت عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف آتیں، وہ فریادیں بھی یہاں سنی جاتیں جو افسرانِ حکومت کے استبداد کے خلاف آتیں[1]۔ اس عدالت عالیہ کی ابتدا حضرت علیؓ نے کی تھی[2]۔ سلاطین بنو امیہ نے اسے باقاعدہ قائم کیا، عبدالملک بن مروان پہلا فرماں روا ہے جو اس کا باقاعدہ اجلاس کرتا تھا۔ عباسی مہدی کے دور سے لیکر مہتدی کے دور تک اس پر کاربند رہے[3]۔ اگر اس عدالت کی اہمیت کی وجہ سے فرمانروا خود اس کے صدر نشین ہوتے۔ اس کے برعکس صورتیں بھی پیش آتیں اور قاضی القضاۃ یا کوئی دوسرا بڑا قاضی خود فرماں روا کے خلاف بھی دادرسی کرتا، نیز قانون کی توضیح و تعبیر کرنے کے لیے فقہا کی ایک صف اس عدالت کے اجلاس کا لازمی جزو ہوتی۔ ہاں، یاد آیا، مصر میں عدالتِ عظمیٰ کا احیا مملوک سلاطین کے دور میں سب سے پہلے بیبرس کے ہاتھوں ہوا[4]۔

عدلیہ اور قاضی القضاۃ کا منصب اب تک ہم نے عدلیہ اور قضاۃ و فقہاء کے سیاسی اثر پر جو گفتگو کی ہے، وہ بغیر اس کے مکمل نہیں ہو سکتی کہ ہم اس سلسلے میں قاضی القضاۃ کے منصب کی قدر و قیمت کا تصور بھی دلائیں۔ اس عہدے کے قیام سے عدلیہ کی حیثیت پر بڑا گہرا اثر مترتب ہوا۔ پھر خیال رہے کہ بعد میں اقتدار نے اسی منصب کو گرا کر "شیخ الاسلامی" کے نمائشی ادارے کی شکل تک پہنچایا۔ یہ عہدہ فی الحقیقت ایک دودھاری تلوار تھا، یعنی اس کے ذریعے ایک طرف پورا محکمۂ قضا مربوط ہو کر مستقل حیثیت اختیار کر گیا اور قاضی القضاۃ کی

---

[1] احکام السلطانیہ - ماوردی - باب ہفتم (استغاثوں کی دس اقسام) - مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن - ص ۳۳۵ — THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM. P 348/349.

[2] حاشیہ [1] کے حوالے ملاحظہ ہوں۔

[3] THE SOCIAL STRUCTURE OF ISLAM----By P:347 - 9.

[4] الخطط - مقریزی - ج ۲، ص ۲۰۸ - مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۲۳۱

شخصیت صدہا فقہاء و قضاۃ کی مرکز اور معاشرہ کے ایک اہم عنصر کی نمائندہ بن کر بجائے خود ایک مضبوط قوت ٹھہری، لیکن دوسری طرف اقتدار کے لیے یہ صورت مفید بھی تھی کہ پورے نظامِ قضا کا ایک بٹن (SWITCH) اس کے انگوٹھے کے تحت موجود ہوا اور اپنے ڈھب کی ایک شخصیت کو مامور کر کے وہ جب جس طرح چاہے، بٹن دبا دیا کرے۔ چنانچہ اس دو دھاری تلوار نے دونوں ہی جانب کاٹ دکھائی۔

عباسیوں کے کارناموں کا ایک اہم باب یہ ہے کہ انہوں نے سلطنت کے ادارات کو ارتقاء دیا۔ قاضی القضاۃ کے عہدہ کی ایجاد کا سہرا بھی انہی کے سر بندھتا ہے۔ اس منصب کا افتتاح امام ابو یوسف (۱۷۰ھ - ۱۸۳ھ) کے تقرر سے (بہ عہد ہارون) ہوا[1] کہا جاتا ہے کہ یہ منصب فارس سے لیا گیا جس کے لیے وہاں "موبذ موبذان" کی اصطلاح رائج تھی[2] مولانا مناظر احسن گیلانی نے (امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی) اس رائے کی سخت تردید کی ہے۔ بعد میں یہ منصب تمام اسلامی سلطنتوں میں قائم ہوتا گیا۔ علامہ سیوطی کے بقول (حسن المحاضرہ) قاضی القضاۃ کے عہدے پر سب سے پہلے ابوالحسن علی نعمان کا تقرر ۳۶۶ھ میں ہوا[3] لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے قبل فاطمی حکومت نے (۳۹۳ھ میں) حسین بن علی بن نعمان کو قاضی القضاۃ کا منصب تفویض کیا اور چونکہ اس کے ذمے شیعی نظامِ تبلیغ کا کام بھی تھا اس لیے اسے "داعی الدعاۃ" کا لقب بھی دیا گیا[4] آل بویہ کے فرماں روا بہاء الدولہ نے ۳۹۴ھ میں ابو احمد

۱؎ تاریخ ابن خلدون - ج ۳، ص ۲۲۴ - خطط مقریزی - مناقب از موفق - ج ۲ ص ۲۳۹ - تاریخ القضاء فی الاسلام از محمد بن محمد بن عرنوس مصری ص ۹۵ تا ۹۷ - امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی ص ۲۵۷ - سیرت ائمہ اربعہ از مولانا رئیس احمد جعفری ص ۲۳۳ - مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے اردو) از پروفیسر حسن ابراہیم حسن ص ۲۱۶ - ۲۱۷ — A SHORT HISTORY OF SARACENS BY AMEER ALI SAYYED P:252 422

HISTORY OF ARABS - BY: HITTI. P:326

۲؎ تاریخ القضاء فی الاسلام از محمود بن محمد بن عرنوس مصری - ص ۹۶ ۳؎ ایضاً ص ۹۶

۴؎ THE SOCIAL STUCTURE OF ISLAM P:388

حسین بن موسیٰ علوی کو قاضی القضاۃ مقرر کیا[1]۔ مغرب میں ہسپانیہ کی اسلامی سلطنت کے تحت عبدالرحمن سوئم اور اس کے جانشین الحکم کے زمانے میں تمام قاضیوں کے اوپر قاضی القضاۃ کا منصب موجود تھا[2]۔ اندلس میں قاضی القضاۃ کو قاضی الجامعہ کہا جاتا تھا[3]۔

یہ منصب اصولاً محدود ہونے کے باوجود کتنی بڑی اہمیت رکھتا تھا اس کا اندازہ کرنے کے لیے اجمالاً یہ جاننا ضروری ہے کہ قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں کیا اختیارات تھے۔ ہم ان اختیارات کا جائزہ مختلف گوشوں سے لیتے ہیں:۔

۱۔ دیکھنے کا اولین پہلو یہ ہے کہ محکمہ عدلیہ کے تمام اختیارات اوپر جاکر قاضی القضاۃ کے ہاتھ میں مجتمع ہو جاتے تھے۔ سو ان اختیارات پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ سب سے پہلے "قضائے عام" کے اختیارات کو لیجیے جنہیں ماوردی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ تھے:۔ قضایا و نزاعات کو فیصل کرنا، حقداروں کو ثابت شدہ حق دلوانا، مجنونوں اور نابالغوں کے اموال کی حفاظت دیوالیے اور سفہا کے مالی معاملات پر حجر (امتناع) عاید کرنا۔ اوقاف کی نگرانی اور ان کے آمد و صرف پر نظر رکھنا، جائز وصیتوں کا نفاذ، بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو ان کے نکاح کا انتظام کرانا۔ حدود کا اجراء، اپنے ماتحت "امینوں" اور شاہدوں کے کردار پر نظر رکھنا اور خائن اور بدکردار افراد کو ہٹا کر بہتر افراد کا تقرر کرنا، مقدمات میں فریقین کے درمیان امتیاز کو ختم کرکے مساوات قائم رکھنا[4]۔

اسی کے ساتھ عدالت فوجداری (نظارت المظالم) کے حدود کار کا نقشہ بھی دیکھیے جس میں قاضی المظالم کی ذمہ داریاں یہ ہیں:۔ رعایا پر حکام کے ظلم و تعدی کے معاملات کی

---

[1] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر حسن ابراہیم۔ ص ۳۲۹۔

[2] تاریخ الخلفاء۔ علامہ سیوطی۔ ص ۲۷۴

[3] HISTORY OF ARABS—BY HITTI. P:527

[4] مسلمانوں کا نظم مملکت (عربی سے ترجمہ) از پروفیسر ابراہیم حسن۔ ص ۲۱۷۔

سماعت، افسرانِ مال کی طرف سے وصولیٔ محاصل میں زیادتی کے دعاوی پر فیصلے کرنا، سرکاری محرِر جو رجسٹروں میں غلط اندراجات کرتے یا اندراجات میں تحریف کرنے والے محرّروں کے خلاف دعاوی سننا، تنخواہیں تقسیم کرنے والوں کی زیادتیوں کا ازالہ کرنا، اموالِ مغصوبہ حقداروں کو دلوانا، اوقاف کی نگرانی، محکمۂ قضا کے فیصلوں کی تنفیذ، محکمۂ احتساب کی پشت پناہی اور جمعہ، عیدین، حج، جہاد وغیرہ عبادات و شعائر کی پابندی اور احترام کرانا اور ان میں کوتاہیوں سے روکنا۔[1]

قضاۃ نے خصومات کے علاوہ عدلیہ کی تحویل میں جو دوسرے بہت سے معاملات تھے ان کی ایک جامع فہرست مصر کے ایک فاضل عطیہ مصطفیٰ نے اپنی تصنیف "القضاء فی الاسلام" میں درج کی ہے۔ اس فہرست میں اوقاف کی نگرانی، بیوہ عورتوں کے نکاح کا انتظام، ناجائز قبضوں اور غلط تعمیروں کی روک تھام، رویتِ ہلال اور دار الضرب (ٹکسال) کی نگرانی جیسے امور شامل ہیں۔[2] قضاۃ نے عامہ مطلقہ کی بعض زائد ذمہ داریوں کو مستشرقین نے بھی لیا ہے جن میں اوقاف، یتامیٰ، مجنونوں اور نابالغوں کی سرپرستی اور ان کے اموال کی نگرانی، مذہبی قانون سے سرتابی کرنے والوں کی سزادہی، نائب قاضیوں کا تقرر اور نمازِ جمعہ کی امامت و خطابت وغیرہ امور شامل ہیں۔[3]

(باقی)

---

[1] احکام السلطانیہ - ماوردی - باب The Social Structure of Islam. P.346
مسلمانوں کا نظمِ مملکت (عربی سے ترجمہ) پروفیسر حسن ابراہیم حسن - ص ۳۲۵

[2] ماہنامہ چراغِ راہ "اسلامی قانون نمبر" جلد اول - مقالہ "اسلام کا نظامِ قضا" از مولانا خلیل حامدی ص ۲۱۰، ۲۰۹

[3] The Social Structure of Islam P. 225 & 326.

عرب ممالک میں اسلامی دستور کا مطالبہ

خلیل حامدی

پچھلے چند سالوں سے اسلامی ممالک اپنے داخلی مسائل میں سے جس مسئلہ میں سب سے زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں یہ ہے کہ حصولِ آزادی کے بعد ان کا دستورِ مملکت کیا ہو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس مسئلہ میں قریب قریب تمام اسلامی ممالک کے اندر دو باتوں میں یکساں ردّ عمل ہوا ہے۔ ہر ملک کی مسلمان اکثریت کی طرف سے دستور کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی خواہش اور اس کا پُر زور مطالبہ۔ اور فرنگی استعمار کی پروردہ حکمراں اقلیت کی طرف سے اس فطری امنگ کو ٹالنے یا زبردستی دبانے کی کوشش۔ یہ بات ہم محض قیاس و گمان کی بنا پر نہیں کہہ رہے ہیں بلکہ پچھلے دس سالہ دَور میں ہم نے اس نقطۂ نظر سے تمام اسلامی ممالک اور بالخصوص نئے آزاد شدہ ممالک کے حالات کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ اس مطالعہ میں ہم نے جو نتائج اخذ کیے ہیں اُن میں سے تین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں :

۱۔ ہر جگہ اس حکمراں اقلیت نے مسلمان اکثریت کی آرزوؤں کو پامال کیا ہے اور ایک دستور ہی نہیں ہر معاملے میں مسلمان عوام کے معتقدات و نظریات اور ان کی تہذیب و ثقافت کی بے حرمتی کی ہے۔ حکمران گروہ کی یہ روش ایک نفسیاتی بیماری پر مبنی رہی ہے جو اُسے تین زبردست غلط فہمیوں کا شکار بناتی رہی ہے۔ ایک یہ کہ مسندِ اقتدار پر فروکش ہونے والا گروہ اپنے آپ کو نہایت پاکیزہ، ہمدردِ قوم اور فرشتہ خصلت سمجھتا رہا ہے اور سابق حکمرانوں کو پیکرِ نجاست و شیطنت اور دشمنِ ملک و ملت۔ دوسری یہ کہ وہ عقلِ کُل اور جانِ جہاں اور واحد نجات دہندہ ہے، تمام زمینی و آسمانی علوم اُس پر عیاں ہیں، اُس کی رائے حق ہے اور اس کے خلاف باطل۔ تیسری یہ کہ سابق حکمرانوں کا عرصۂ اقتدار

اگرچہ عارضی تھا لیکن اس کا اقتدار اتنا ہی دیرپا ہے جتنی یہ کائنات۔ ان تینوں غلط فہمیوں کے زیر اثر حکمران گروہوں نے جو اقدامات کیے ہیں ان کا نتیجہ بالعموم یہ نکلتا رہا ہے کہ حکام اور عوامی رجحانات و مطالبات میں تصادم کی کیفیت رہی ہے۔

۲۔ متعدد اسلامی ممالک میں اور خاص طور پر انڈونیشیا، سوڈان اور مصر میں اسلامی دستور کے مطالبے کا عوامی قافلہ ایمان و یقین کا سرمایہ لے کر رُو بمنزل ہوا۔ حکمران گروہ سے کشمکش کرتا ہوا جانب منزل رواں رہا۔ اور جب منزل دو چار ہاتھ رہ گئی تو یکایک ایک طوفان آیا اور اس نے برسوں کی تمام مساعی پر پانی پھیر دیا۔ پھر ملّی اتحاد کے اس مضبوط رشتہ کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں داخلی طور پر انتشار اور مرکز گریز رجحانات پرورش پانے لگے اور بین الاقوامی میدان میں ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے ساکھ برقرار نہ رہ سکی۔

۳۔ مسلمان عوام کے اسلامی جذبات کو اگرچہ پوری قوت کے ساتھ دبانے کی کوشش کی گئی ہے اور کچھ مدت کے لیے نہتے عوام اپنے مسلح فاتحین کے سامنے دب بھی گئے ہیں مگر یہ جذبات اندر ہی اندر پک رہے ہیں۔ ان کی سُلگتی ہوئی چنگاریاں گاہے بگاہے نمودار ہوتی رہتی ہیں اور توقع یہی ہے کہ یہ کبھی بھسم نہ ہونگی۔ چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ آج سے چار پانچ سال قبل اسلامی ممالک میں اسلامی دستور کا جو مطالبہ زور و شور سے اٹھا تھا اور بالآخر ہر جگہ اُسے دبا دیا گیا تھا وہی مطالبہ اب پھر کروٹ لے رہا ہے اور وہ دَور آیا چاہتا ہے کہ یہ عارضی دباؤ ختم ہوتے ہی وہ پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس دینی و فطری طلب کو کوئی طاقت کچلنے کی ہمت نہیں رکھتی۔

مصر میں ۵۲ء تک عوام کی جانب سے اسلامی دستور کا تقاضا پورے زور پر تھا۔ مگر ۵۲ء کے اواخر میں ناصر صاحب سنگین بدوش آگے بڑھے اور اس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ جون ۵۶ء میں انہوں نے اپنی جیب سے ایک نرالا دستور نکال کر قوم کو عطا فرمایا۔ پھر شام و مصر کے انضمام کے بعد شام کے جمہوری دستور کو بھی منسوخ کر ڈالا اور پوری متحدہ عرب جمہوریہ ایک عارضی دستور

کے زیر نگیں آ گئی۔ ناصر صاحب نے اس عرصہ میں پوری کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مستقل دستور کی تدوین کو ٹال کر اپنے آپ کو یوم الحساب سے بچاتے رکھیں۔ مگر یہ ایسی خواہش نہ تھی کہ بین الاقوامی حالات اور اندرونی تشدد و دیر تک اس کا ساتھ دیتے۔ بالآخر وہ ملک کے لیے مستقل دستور مدون کرنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ ایک دستور ساز کمیٹی قائم کر دی گئی۔ اب اِدھر دستور سازی کے چرچے شروع ہوتے ہیں اور اُدھر عوام کے اسلامی جذبات نے بھی انگڑائی لی ہے۔

اس سلسلے میں مصر کے مشہور اسلامی پرچے "لواء الاسلام" بابت مئی ۱۹۶۱ء کی ایک تازہ خبر ملاحظہ فرمائیں:

"مجلہ لواء الاسلام کے دفتر میں دمشق سے ایک تار کی نقل موصول ہوئی ہے جس پر دمشق یونیورسٹی کے ۶ سو طلباء کے دستخط ہیں۔ یہ تار متحدہ عرب جمہوریہ کی دستور ساز اتھارٹی کو بھیجا گیا ہے۔ تار کا متن یہ ہے:

"قوم کو ان حضرات پر پورا اعتماد ہے جو اس کی امنگوں کو بروئے کار لانے کے لیے عظیم تمناؤں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ آپ حضرات متحدہ عرب جمہوریہ کے لیے ایک مستقل دستور کی تدوین کا آغاز کر رہے ہیں۔ یہ ملک نہ صرف عربوں کی جنگِ حریت کا صدر مقام ہے بلکہ ایشیائی اور افریقی اقوام کی نگاہوں کا بھی مرکز بنا ہوا ہے۔ عرب قوم کا سرمایۂ اسلاف اور اس کے نظریات و عقائد اسلام پر مبنی ہیں۔ اور اسلام ہی اسے دنیا کی قانونی اور فکری قیادت سے بہرہ مند کر سکتا ہے۔ اس لیے ہم دمشق یونیورسٹی کے طلباء مجبور ہیں کہ دستور ساز اتھارٹی کو یہ یاد دہانی کرائیں کہ اس کا یہ فرض ہے کہ زیرِ ترتیب دستور میں مندرجۂ ذیل اصولوں کو بنیادی دفعات کی حیثیت سے شامل کرے:

۱۔ ریاست کا مذہب اسلام ہوگا (جیسا کہ سابق مصری دستور میں تھا)

۲۔ اسلامی شریعت ہی قانون سازی کا اصل ماخذ ہوگی (جیسا کہ سابق شامی دستور میں تھا)۔

۳۔ تعلیم، ثقافت، قومی رہنمائی، لیبر اور معاشرتی بہبود کی وزارتوں کو ایسی ہدایات دی جائیں جن کے تحت یہ سب وزارتیں مسلمان عوام کے دین اور اسلامی اخلاق کی حفاظت کریں۔

۴۔ دستور میں جو دفعات بھی رکھی جائیں، خواہ ان کا تعلق افراد سے ہو، یا جماعتوں سے یا ریاست سے، ضروری ہے کہ ان کو مدوّن کرتے وقت اسلامی آداب اور اسلامی تعلیم کو پیش نظر رکھا جاتے۔

۵۔ وہ تمام آرڈیننس، ریگولیشن اور فرامین منسوخ قرار دیئے جائیں جو مذکورہ بالا اصولوں کے منافی ہوں۔

ہمیں قوی امید ہے کہ جس قوم کی نمائندگی آپ حضرات کے سپرد کی گئی ہے اُس قوم کی آرزوؤں کو آپ روبعمل لانے کی کوشش کریں گے تاکہ ہمارا عمل ہمارے اُن دعاوی سے ہم آہنگ ہو جائے جو اسلام کے بارے میں ہم وقتاً فوقتاً کرتے رہتے ہیں اور جن کا اظہار خود صدر جمال عبدالناصر نے اپنی بیشتر تقریروں میں کیا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: وذکر فان الذکری تنفع المؤمنین۔"

اس تار کے بارے میں "لواء الاسلام" نے جو چند حرفی تبصرہ کیا ہے وہ بھی ملاحظہ ہو:

"ہمیں یقین ہے کہ ہر مسلمان اور ہر عرب کی یہی خواہش ہے۔ دستور قومی امنگوں کا آئینہ دار ہوتا ہے اور اُس کے نظریات کا محافظ ہوتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دستور ساز کمیٹی اس تار کے جلیل القدر مضامین کا خاطر خواہ پاس رکھے گی۔"

ظاہر ہے کہ جس ملک میں پریس پوری طرح حکومت کے کنٹرول میں ہو اور خبریں اور رائیں، سب راشن کے ذریعہ سے ملتی ہوں، وہاں ایک پرچہ اس موضوع پر اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھ سکتا۔

اس کے ساتھ ہی ایک دوسری خبر ملاحظہ ہو جس کا ماخذ لبنان کا ہفتہ وار اخبار "المجتمع" اور

دمشق کا ماہنامہ "حضارۃ الاسلام" ہیں:

"پچھلے دنوں رباط (مراکش) میں ایک عظیم الشان کانفرنس منعقد ہوئی ہے۔ اس کانفرنس میں ملک کے اطراف سے تقریباً تین سو اہلِ علم و فکر حضرات نے شرکت کی ہے۔ اور ملک کے تمام بڑے بڑے علمی اداروں نے، جن میں قرویین یونیورسٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، اپنے نمائندے بھیجے ہیں۔ اس کانفرنس میں گہرے غور و خوض کے بعد ذیل کی قراردادیں بالاتفاق پاس کی گئی ہیں:

دستور

۱۔ زیر ترتیب دستور میں یہ واضح کر دیا جائے کہ ریاست کا سرکاری مذہب اسلام ہوگا اور ریاست کی سرکاری زبان عربی ہوگی۔

۲۔ یہ واضح کر دیا جائے کہ قرآن کریم اور سنتِ نبوی قانون سازی کا ماخذ ہوں گے (کانفرنس ہر اُس دفعہ کی مخالفت کرے گی جو اپنے الفاظ اور مفہوم دونوں کے لحاظ سے اسلامی شریعت کے منافی ہوگی)۔

۳۔ دستور سازی کے لیے جن حضرات کی خدمات حاصل کی جائیں، ضروری ہے کہ وہ ایک طرف شریعت اسلامی اور اُس کے بنیادی مقاصد کا وسیع علم رکھتے ہوں اور سیرت کے لحاظ سے بھی بے داغ ہوں۔ اور دوسری طرف ملک کے ماحول کا گہرا مطالعہ رکھتے ہوں اور ضروری اہلیت و قابلیت کے شرائط پر پورے اترتے ہوں۔

۴۔ دستور میں یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ مراکش عرب قوم کا ایک حصہ ہے۔ اور عربوں کے اتحاد کو اپنا مطمح نظر رکھتا ہے۔ عرب اور مسلمانوں کے اتحاد کے لیے پہلے قدم کے طور پر دستور میں مغرب عربی (یعنی مراکش موریتانیا الجزائر اور تونس) کو ایک وحدت قرار دیا جائے۔

تعلیم

۱۔ یہ کانفرنس اس خطرناک پالیسی کی شدید مذمت کرتی ہے جس کے تحت ملک کے اندر فرانسیسی زبان کے نفوذ کی حفاظت کی جا رہی ہے اور اُسے تمام وزارتوں میں، تمام محکموں میں،

تعلیم کے تمام مراحل میں اور اکثر مذہبی مدارس میں بھی سرکاری زبان قرار دیا جا رہا ہے۔ اور ملکی زبان (عربی) کو اور اُس کے حامیوں کو تمام میدانوں سے پیچھے ہٹایا جا رہا ہے۔ یہ وہ پالیسی ہے جس کے تحت آج آزادی کے ۵ سال گزر جانے کے بعد بھی، پرائمری اسکولوں تک میں عربی زبان کو تعلیمی زبان قرار دینے سے انکار کیا جا رہا ہے (سکنڈری اسکول اور کالج تو کجا مراکش کے پرائمری اسکولوں کی سرکاری زبان بھی ابھی تک فرانسیسی ہے)

۲- یہ کانفرنس جلالتہ الملک کی حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ حکومت کو عوامی مطالبات کا احترام کرنا چاہیے۔ عوام اپنی قومی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔

۳- یہ کانفرنس تعلیمی امتیازات کی پالیسی کی شدید مذمت کرتی ہے۔ اس پالیسی کی رُو سے فرانسیسی زبان کے سند یافتگان کے لیے تمام سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھُلے ہوتے ہیں اور عربی زبان کے سند یافتہ کے لیے تمام دروازے مسدود ہیں۔ اس امتیاز کی تہ میں محض یہ تعصب کام کر رہا ہے کہ قومی زبان اور اس کے حامیوں کو زیادہ سے زیادہ ذلیل کیا جائے۔"

کانفرنس میں اجتماعی امور کے بارے میں بھی متعدد قراردادیں پاس کی گئیں اور حکومت سے معاشرتی مفاسد کے انسداد کے مطالبے کیے گئے۔

(بقیہ اشارات)

وہ زمانے کی غلام نہیں بنتی بلکہ زمانہ اپنی رفتار کے لیے اُن کے اشارۂ ابرو کا منتظر رہتا ہے۔ وقت کے باطل تصورات کے خلاف صف آرا ہونا ہی تو دراصل اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ سے سوائے اپنی غلامی کے کسی دوسری غلامی کا مطالبہ نہیں کیا۔ اس لحاظ سے وہ نہ تو کسی انسان کی غلام ہے اور نہ ہی خطرت اور رفتارِ زمانہ کی۔ اس کی کوششوں کا صحیح مرکز و محور ایک ہی رہا ہے کہ لوگوں نے جن غلط راہوں کو اپنے لیے منتخب کر رکھا ہے اُن سے انہیں ہٹا کر اسلام کی اصلی شاہراہ پر انہیں گامزن کیا جائے۔ یہی اس کے نزدیک ایک ایسا تقاضا ہے جو زمان و مکان کے اختلاف کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہے اور جب تک یہ دنیا موجود ہے وہ قائم رہے گا۔ اس ایک تقاضے کے علاوہ اور جتنے تقاضے ہیں وہ سب کے سب باطل اور گمراہ کن ہے اور ایک مسلمان کی نظر میں اُن کی حیثیت پرِ کاہ کے برابر نہیں ہوتی۔

ایک ضروری اعلان

ہم نے اس امر کا اہتمام کیا ہے کہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، مکتبہ چراغ راہ، مکتبہ تعمیر انسانیت اور دوسرے اسلامی لٹریچر شائع کرنے والے اداروں کی کتب دفتر ترجمان القرآن سے بھی ضرورت مند حضرات کو مل سکیں۔ قارئینِ کرام اپنی ضرورت کے مطابق آرڈر بھیج سکتے ہیں۔

مینجر شعبۂ کتب، ادارہ ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور

اِسلام کے خاندانی نظام پر مُستند کتابیں

اجتماعی زندگی میں عورت کا مقام کیا ہے اور عورت و مرد کے باہمی تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟

عورت اور مرد کا ازدواجی تعلق درحقیقت انسانی تمدن کا سنگ بنیاد ہے اور کوئی فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد اس قانون کے دائرے سے خارج نہیں ہو سکتا جو اس تعلق کو منضبط کرنے کیلیے بنایا گیا ہو کیونکہ بچپن سے لیکر بڑھاپے تک عمر کے ہر حصہ میں یہ قانون کسی نہ کسی حیثیت سے انسان کی زندگی پر ضرور اثرانداز ہوتا ہے۔ اگر وہ بچہ ہے تو ماں اور باپ کے تعلقات اس کی تربیت میں مؤثر ہونگے۔ اگر جوان ہے تو خود اس کو ایک شریک زندگی سے واسطہ پڑے گا۔ اگر سن رسیدہ ہے تو اس کی اولاد ازدواجی تعلقات میں بندھیگی اور اس کے قلب و روح کا سکون اور اس کی زندگی کا چین بڑی حد تک بیٹے بیٹی اور بہو داماد کے تعلقات کی بہتری پر منحصر ہوگا۔ غرض قانون ازدواج ایسا قانون ہے جو قوانین تمدن میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ وسیع الاثر ہے۔ اسلام کے قانونِ ازدواج کو ٹھیک سمجھنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ فرمائیے۔

پردہ
نواں ایڈیشن
قیمت -/۴
از سید ابوالاعلیٰ مودودی

حقوق الزوجین
چھٹا ایڈیشن
قیمت -/۲
از سید ابوالاعلیٰ مودودی

میرج کمیشن رپورٹ
ایکسرےڈ
قرآن و سنت کی روشنی میں
انگریزی ایڈیشن ۱۰ روپے
اردو ۲/۱۲

اسلام اور ضبط ولادت
چھٹا ایڈیشن
قیمت -/۱
از
سید ابوالاعلیٰ مودودی

کیا پردہ مُلک کی ترقی کی راہ میں رُکاوٹ ہے — ؟
از: میر دین رضوی — قیمت ۲ر

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۱-سی، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

قوا انفسکم واھلیکم نارا

اُردو زبان میں دینِ اسلام کو سمجھنے کا بہترین ذریعہ!

رسالہ
دینیات
۱۸ ایڈیشن

از

ابو الاعلیٰ مودودیؒ

★ دینِ اسلام کیا ہے؟
★ کیا چاہتا ہے؟
★ اور کیوں چاہتا ہے؟

— اس کے بنیادی عقاید!
— ان کی صحت اور صداقت کا عقلی ثبوت!
— اِن عقاید کا اِنسان کی زندگی سے تعلق!

• وہ اگر تسلیم کیے جائیں تو اُن کا فائدہ —؟
• نہ تسلیم کیے جائیں، تو اُن کا نقصان —؟

دین اور شریعت کا فرق، اِسلامی عبادات کی حقیقت، حکمتیں اور اُن کے فائدے،
قرآن، حدیث، فقہ اور تصوف کی حقیقت اور اِسلامی نظامِ زندگی میں ان کا مقام،
— اِسلامی تہذیب و تمدن کے بنیادی اُصول اور احکام —

اِن اُمور سے متعلق : قرآن مجید کی تعلیمات کو اِس کتاب میں ایسے ایمان افروز، عام فہم اور دلنشین انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ عام اُردو دانوں سے لیکر اُونچے تعلیم یافتہ اصحاب تک سبھی اِس سے یکساں استفادہ کر سکتے ہیں۔ اِسی لئے یہ کتاب تعلیمی حلقوں میں بطور نصاب بیحد مقبول ہوئی ہے، لائبریریوں میں شامل کی جاتی ہے اور گھروں میں پڑھی جاتی ہے۔ دنیا کی دس بارہ زبانوں میں اِس کے تراجم شائع ہو چکے ہیں اور اُردو میں یہ ۱۸ ایڈیشن ہے۔

مولینا مودودی کی خداداد قابلیت کا ایک شاہکار

اِسے خود مطالعہ فرمایئے، اپنے اہل و عیال اور احباب کو پڑھایئے!

سائز ۲۰×۳۰/۱۶
صفحات ۱۲۶
جلد [illegible]
قیمت ۲/۸/۰

ناشرین: اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی)

برانچ : ۱۱-سی شاہ عالم مارکیٹ لاہور